جلد ۸۶ — اکتوبر ۱۹۷۶ء — عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۲	اکتوبر ۱۹۷۶ء مطابق شوال ۱۳۹۶ھ	جلد ۸۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ، لاہور

فون نمبر: ۴۱۱۰۱۶ — ۴۱۱۰۱۷

زرسالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

"حقوقِ نسواں کمیٹی برائے پاکستان" خلع کے پردے میں جس طرح کا غیر مقید اور بے دریغ "حق طلاق" عورت کو دینا چاہتی ہے اور طلاق کے بعد جس طرح مطلقہ کو طلاق دہندہ کی جائداد منقولہ و غیر منقولہ میں حصہ دار بنانا چاہتی ہے، اس پر ترجمان کے دو سابق شماروں میں ضروری بحث کی جا چکی ہے اور دلائل و براہین سے یہ امر واضح کیا جا چکا ہے کہ یہ دونوں سفارشیں کتاب و سنّت کی تعلیمات اور عقل و انصاف کے مقتضیات سے کس قدر دور ہٹی ہوئی ہیں۔ یہ دراصل مغربی تہذیب و تمدن سے مفتوح و مغلوب ذہن کی پیداوار ہیں، ان سے مسلمانوں کے ازدواجی مسائل و مشکلات میں سے کوئی مشکل آسان نہیں ہو سکے گی، البتہ فرنگی اقوام کے طور طریقوں کو یہاں رائج کرنے میں ضرور مدد ملے گی۔ اب تک کی بحث میں رپورٹ کی دفعہ ۴۰ تک کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔ اب ہم اس سفارش کو لیتے ہیں جو دفعات ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴ میں تجویز کی گئی ہے۔ اس سفارش کا ترجمہ درج ذیل ہے:

> "کمیٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ طلاق کے بعد اپنی بیوی کو نان و نفقہ دینے کی شوہر کی ذمہ داری "عدت" کا زمانہ گزرنے کے بعد ختم نہیں ہونی چاہیے۔ جیسا کہ اس سے پہلے دیکھا گیا ہے کہ ایسی صورتیں ہیں جہاں سابق بیوی کے پاس کوئی علیحدہ و جداگانہ ذریعۂ معاش نہیں ہوتا ہے۔ اور اس طرح "عدت" کا زمانہ گزرنے کے بعد اسے سنگین معاشی اور مالی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ قانون کے تحت شوہر کو آزادی ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے خواہ وہ اس کے ساتھ کتنی ہی مدت کے لیے رہ چکی ہو۔ عمر رسیدہ عورتوں کی صورت میں شوہر کی طرف سے استعمال کردہ طلاق کے حق کا نتیجہ واقعی سخت اذیت کی صورت میں نکلتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس عمر میں اس کے لیے دوسری شادی کرنا ممکن نہ ہو اور اسی طرح اس کے لیے یہ بھی ممکن نہ ہو کہ اپنی معاش خود کمائے۔ کمیٹی کا خیال ہے کہ شوہر کی طرف سے طلاق کے حق کا خود اختیاری استعمال کس حد تک روکا جا سکتا ہے اگر شوہر کو حکم دیا جائے کہ وہ ایک خاص مدت کے لیے اپنی سابق بیوی کا مالی بوجھ اٹھائے۔

کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ:

شوہر کی طرف سے طلاق کی صورت میں اسے حکم دیا جائے کہ عدت کے زمانے کے علاوہ شادی شدہ زندگی کے ہر سال کے لیے ایک ماہ کے حساب سے شمار کی جانے والی مدت کے لیے اپنی سابق زوجہ کو نان و نفقہ ادا کرے۔"

اس کمیٹی کی رپورٹ میں ایک عجیب چیز جو مشاہدے میں آرہی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے وہ ایک انتہائی نادر الوقوع صورت فرض لیتی ہے جس میں خاوند بڑا ظالم و سنگدل اور بیوی بے حد مظلوم و معصوم دکھائی دیتی ہے اور پھر اس صورت کو ایک عامۃ الورود اور آئے دن پیش آنے والا واقعہ قرار دے کر کمیٹی اس کے لیے ایک عام قانونی سفارش پیش کر دیتی ہے۔ چنانچہ دفعہ نمبر ۴ میں جب مطلّقہ کو طلاق دہندہ کی جائداد میں حصہ دار بنانے کا مطالبہ کیا گیا تو اس کے لیے یہ دلیل دی گئی کہ:

"بعض اوقات شوہر کی طرف سے بستر مرگ پر بھی حق طلاق اس خیال کے پیش نظر استعمال کیا جاتا ہے کہ اس کی موت کے بعد بیوی کو اس کی جائداد میں سے حصّہ کا دعویٰ کرنے سے محروم کر دیا جائے۔"

یہاں بسترِ مرگ پر طلاق دینے کی جو مثال دی گئی ہے وہ بالکل شاذ و نادر ہے اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا جا رہا ہے وہ قوانین شرعیہ سے بے خبری پر دلالت کر رہا ہے۔ اسلامی قانونِ وراثت کا یہ مسئلہ معروف و مسلّم ہے کہ مرض الموت کی طلاق خواہ مغلّظہ ہی کیوں نہ ہو وہ مطلّقہ معتدّہ کو محروم الارث نہیں کر سکتی۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے اپنی اہلیہ کو ایسی طلاق دی تھی اور عدّت گزرنے سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا تو خلیفہ راشد حضرت عثمانؓ نے مطلّقہ کو حضرت عبدالرحمٰنؓ کی میراث میں سے حصّہ دلایا[1]۔ یہ مسئلہ صحابہ کرام کے مجمع عام میں پیش ہوا اور سب نے اس سے اتفاق کیا۔ عورت کا یہ حقِ میراث صرف طلاقِ مریض تک محدود نہیں بلکہ فقہاء نے اس پر قیاس کر کے "طلاق الفار" میں بھی عورت کو وارث قرار دیا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک مرد قتل کے مقدمے میں ماخوذ ہے، یا دشمن سے لڑ رہا ہے، یا پُر خطر سفر پر روانہ ہو رہا ہے، یا کسی دوسرے

---

[1] موطا امام محمد اور بعض دیگر ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کی وفات عدّت گزر جانے کے بعد ہوئی۔ چنانچہ امام مالک اور بعض فقہاء اس صورت میں بھی وراثت کے قائل ہیں۔

مہلک حادثے کی زد میں ہے اور وہ عورت کو طلاق دے دیتا ہے تو یہ طلاق بھی عورت کے لیے مانع وراثت نہ ہو گی۔ اب کمیٹی کے معزز ارکان سے ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ بستر مرگ کی طلاق جب صحابہ کرام اور فقہائے اسلام کے اجماع کے مطابق مطلقہ کی وراثت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تو آپ مُورث کی وفات سے پہلے ہی اس کی جائداد کے حصّے بخرے کیوں کرنا چاہتے ہیں؟

بہر کیف خواتین پاکستان سے بے پناہ اور بے حساب ہمدردی و شفقت کا یہ کرشمہ ہے کہ کمیٹی نے مطلقہ کو سابق شوہر کی جائداد میں حصّہ دار بنانے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ مزید یہ بھی محسوس فرمایا کہ "طلاق کے بعد اپنی بیوی کو نان و نفقہ دینے کی شوہر کی ذمہ داری عدت کا زمانہ گزرنے کے بعد ختم نہیں ہونی چاہیے" (دفعہ ۴۱)۔ یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ طلاق دینے اور عدت گزر جانے کے بعد نان و نفقہ کی یہ ذمہ داری طلاق دینے والے پر ڈالنے کے لیے آخر شرعی یا عقلی بنیاد کیا ہے؟ "اپنی بیوی" اور "شوہر" کے الفاظ استعمال کر کے کیا یہ تأثر پیدا کرنا مقصود ہے کہ عدت کے بعد بھی رشتۂ ازدواج منقطع نہیں ہوا، اس لیے طلاق دینے والے کو مطلقہ کے اخراجات کا ایک حصّہ ادا کرتے رہنا چاہیے؟ اگر فی الواقع ان تجاویز کے تحت یہی تصور کام کر رہا ہے تو ہم صاف طور پر کہیں گے کہ یہ ایک خالص ہندوانہ اور مسیحیانہ تصور ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہندوؤں اور عیسائیوں کے ہاں یہ نظریہ صدیوں تک رائج رہا ہے اور اس کے اثرات اب تک موجود ہیں کہ رشتۂ ازدواج دائمی اور ناقابلِ انقطاع ہے۔ اس لیے طلاق و تفریق کے باوجود سابق خاوند کو اس امر کا مکلف سمجھا گیا ہے کہ وہ اپنی مطلقہ کی ضروریاتِ زندگی فراہم کرتا رہے۔ مطلقہ کے ان اخراجاتِ پرورش کو مغربی ممالک میں ALIMONY کا نام دیا گیا ہے۔ ارکانِ کمیٹی نے غالباً "بر بنائے مصلحت" اپنی اصل رپورٹ میں اس مغربی اصطلاح کے استعمال سے گریز کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مطلقہ کو طلاق دینے والے کی جائداد سے حصّہ دلا کر اور حصّہ دلانے کے بعد اس پر مطلقہ کے نفقہ کا مزید مالی بار عاید کر کے اُسی غیر اسلامی تصور کی داغ بیل اسلامی معاشرے میں ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر ایک دفعہ یہ بنیاد پڑ گئی اور اس اصول کو تسلیم کر لیا گیا کہ وقوعِ طلاق اور انقضائے عدت کے بعد بھی مطلقہ کے اخراجاتِ حیات کا بار طلاق دینے والے پر ڈالا جا سکتا ہے تو اس کے بعد وہی سب کچھ ہو گا جو مغرب میں ہو رہا ہے اور جس کے نتیجے میں اکثر گھروں کا امن و سکون غارت ہو چکا ہے۔

مطلقہ کی پرورش MAINTENANCE کا یہ تخیل جو دیارِ مغرب میں مروّج ہے اور جس کا چلن عام کرنے کی تجویز و تدبیر یہاں کی جا رہی ہے اس کا کوئی تعلق نان و نفقہ کی اُن صورتوں سے نہیں ہے جو اسلام میں معروف و مسنون ہیں۔ عورت جب تک خاوند کے نکاح میں ہے، اس کا نان و نفقہ فراہم کرنا خاوند پر فرض ہے خواہ عورت صاحبِ جائداد و املاک ہی کیوں نہ ہو۔ اگر مرد نفقہ فراہم نہ کرے تو عورت اسے بذریعہ قانون وصول کر سکتی ہے یا خاوند کے نام پر قرض لے سکتی ہے جس کی ادائیگی خاوند ہی کے ذمے ہو گی۔ اگر عورت کو خدانخواستہ طلاق ہو جائے تو وہ عدّت کے دوران میں بھی خاوند ہی سے نفقہ لے گی۔ اگر وہ حاملہ ہے اور طلاق ہوئی ہے تو نہ صرف ایام حمل بلکہ بچے کی مدتِ شیر خوارگی کے ایام میں بھی زچہ و بچہ کے اخراجات بچے کے والد کے ذمے ہوں گے۔ والد کی جو اولاد بھی اس عورت سے ہو گی وہ دودھ چھڑانے کے بعد بھی اگر والدہ چاہے تو اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔ اگر لڑکا ہے تو وہ سات سال تک اور لڑکی ہے تو نو برس تک یا ایک قول کے مطابق بالغ ہونے تک اسے والدہ اپنے پاس رکھ سکتی ہے اور اس اولاد صغار کے جملہ اخراجات والد ہی کے ذمہ ہوں گے۔ عورت صرف اسی صورت میں اس حقِ حضانت سے محروم ہو سکتی ہے جبکہ وہ کسی ایسے مرد سے نکاح ثانی کرے جو اولاد کے لیے اجنبی اور غیر محرم ہو۔ اور سابق خاوند یہ مطالبہ کرے کہ میری اولاد مجھے واپس دلائی جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے بعد بھی مطلقہ کو سابق شوہر کی جائداد اور معاش میں مزید شریک بنانا کس اصول کے تحت جائز و روا ہو سکتا ہے؟

کمیٹی کی رپورٹ یہ کہتی ہے کہ فرض کیا عورت بوڑھی ہے اور بے اولاد بھی ہے، بڑھاپے میں اسے طلاق مل جاتی ہے تو اس کا پرسانِ حال کون ہو گا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ جو عورت بے اولاد ہو گی (اور آپ عورتوں اور مردوں کو بانجھ بنانے کی پہلے ہی سعی فرما رہے ہیں) وہ مشکل ہی سے بڑھاپے تک ایک ہی خاوند کے پلّے بندھی رہے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے پہلے نکاح کا جلد ازالہ ہو جائے اور وہ دوسرا نکاح کر لے۔ تاہم میاں بیوی دونوں صابر و شاکر ہیں اور اپنی جوانی کو یکجا رفاقت کے ساتھ بڑھاپے میں تبدیل کرتے ہیں تو شاید ہی کوئی خاوند ایسا بُرا اور ناقدرا ہو گا جو ایسی بیوی کو جوانی میں تو نہیں مگر سن رسیدگی کے عالم میں طلاق دے گا۔ پھر بھی ہم مانے لیتے ہیں کہ ہمارے فاسد معاشرے میں ایسی صورتوں کا وقوع ممکن ہے اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی بے سہارا عورتوں کی دستگیری کون کرے گا؟ مگر یہ سوال صرف بوڑھی بے اولاد مطلقات تک محدود نہیں

ہے بلکہ یہ سوال معاشرے کے ان تمام نادار و محتاج افراد کے بارے میں پیدا ہوتا ہے جن میں بچے، نوجوان، بوڑھے مرد، عورتیں سب شامل ہیں، جو معذور، بے کار اور بے یار و مددگار ہیں۔ اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ ایسے افراد کے اگر خوشحال عزیز اور قرابت دار موجود ہوں تو ان پر لازم ہے کہ وہ صلہ رحمی کے اصول پر اپنے ان رشتہ داروں کی کفالت کریں، اگر وہ نہ کریں تو بستی یا آبادی کے سب لوگ حسبِ استطاعت ان کی مدد کریں۔ اور یہ بھی نہ ہو تو اسلامی ریاست کی یہ ناگزیر ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے تمام غیر مستطیع شہریوں کی اعانت بیت المال سے کرے، جس پر ایسے تمام افراد کا یکساں حق ہے جو کسی عذرِ معقول کی بنا پر اپنی معاش کے حصول سے عاجز ہوں۔ لیکن جہاں تک ایک مطلقہ خاتون اور اس کے سابق شوہر کا تعلق ہے، عدت گزر جانے کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعاً اجنبی اور غیر محرم ہیں اور ایک دوسرے پر ان کے مالی حقوق و واجبات رشتۂ ازدواج کے انقطاع کے بعد از سر نو کسی درجے میں بھی پیدا نہیں ہو سکتے۔ جہاں تک نان و نفقہ کا تعلق ہے اسلامی شریعت میں اس کے وجوب کی چند متعین صورتیں ہیں۔ مثلاً والدین بالخصوص جب وہ محتاج ہوں، ان کا نان و نفقہ بالغ اولادِ نرینہ کے ذمہ ہے۔ اولاد جب تک نابالغ اور غیر شادی شدہ ہے اس کا نفقہ والد کے ذمہ ہے۔ بلوغ و نکاح کے بعد اگرچہ والد کا رشتۂ نسب اولاد سے منقطع نہیں ہوتا مگر والد پر اولاد کے نان و نفقہ کے قانونی حقوق ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر مطلقہ اپنے سابق خاوند سے نفقہ یا حصۂ جائداد کی حقدار ہوتی تو غریب بالغ اولاد اور بہن بھائی بدرجہ اولیٰ اس کے مستحق تھے کہ ان کو بھی نفقہ اور جائداد سے حصہ ملتا۔

کمیٹی کا اگر یہ خیال ہے کہ مطلقہ کے اس نئے مالی حق کی تخلیق سے طلاق میں کمی ہو جائے گی تو یہ خیال بھی بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ مغربی ممالک میں، جیسا کہ بیان ہوا، بالعموم مطلقہ کو خرچہ دلوایا جاتا ہے اور طلاق یا تفریق بھی عدالت ہی کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ان ممالک میں طلاق کی بھرمار ہے۔ اور کمیٹی کے ارکان ہم سے زیادہ اس بات سے واقف ہیں کہ وہاں رشتۂ ازدواج ایک تارِ عنکبوت، ایک کچا تاگا بن کر رہ گیا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے روزنامہ "سن" لاہور کا ۲۹ اگست کا شمارہ ہے۔ اس کے صفحہ ۹ پر آسٹریلیا کے قومی شماریات بورڈ کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۴ء تک طلاق کی تعداد میں چھیاسٹھ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ اس بورڈ کے اندازے کے مطابق اس سال کے آخر تک

عدالتوں کے ذریعے سے پچاس ہزار طلاقوں کا نفاذ ہوچکا ہوگا۔ اس رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ طلاق کی رفتار میں ترقی اس امر کے باوجود ہے کہ نکاح کی شرح میں اضافہ کی بجائے کمی واقع ہو رہی ہے، کیونکہ بہت سے جوڑے اب نکاح کو ایک فرسودہ رسم سمجھتے ہیں، جب چاہتے ہیں آزادی سے یکجا ہوتے ہیں، جب چاہتے ہیں جدا ہوجاتے ہیں۔ نکاح و طلاق کے جھنجھٹ ہی میں نہیں پڑتے۔ ظاہر ہے کہ آسٹریلیا اتنا "ترقی یافتہ" نہیں ہے، جتنا کہ امریکہ، فرانس یا رُوس ہے۔ اس لیے ان ممالک کا حال آسٹریلیا سے بہتر نہیں، بلکہ بدتر ہی ہوگا چنانچہ امریکہ کے ایک رسالے اویک (AWAKE) کے ۸ رجون ۱۹۷۶ء کے شمارے میں بتایا گیا ہے کہ گزشتہ سال وہاں دس لاکھ چھبیس ہزار طلاقیں نافذ کی گئیں اور یہ تعداد گزشتہ سالوں سے دُگنی ہے۔ گزشتہ برس کل نکاحوں کی تعداد بیس لاکھ دس ہزار ہے، گویا کہ ہر دو شادیوں میں سے ایک کا خاتمہ طلاق پر ہوا۔ مضمون نگار نے خود تسلیم کیا کہ یہ صورت حال عائلی زندگی کی عمومی تباہی (GENERAL BREAK DOWN OF FAMILY LIFE) کا بیّن ثبوت ہے۔ اس سے ہر پاکستانی مسلمان بآسانی یہ اندازہ کرسکتا ہے کہ جو "نسوانی حقوق" یہ کمیٹی ہماری خواتین کے سر منڈھنا چاہتی ہے اس کا نتیجہ بالآخر کیا نکلے گا؟

"سر منڈھنے" کا لفظ ہم یونہی استعمال نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہم اسے خوب سوچ سمجھ کر پوری ذمہ داری کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔ ہمیں اس بات کا کامل یقین ہے کہ ہمارے ملک کی ننانوے بلکہ ساڑھے ننانوے فی صد سے بھی زیادہ خواتین صرف وہ حقوق مانگتی ہیں جو قرآن و سنّت میں مذکور ہیں، یا جنہیں فقہائے اسلام نے قرآن و حدیث سے اخذ کر کے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور اس سے زیادہ کسی شے کا مطالبہ نہیں کرتیں۔ یہ کمیٹی جس نے یہ رپورٹ تیار کی ہے اس کے ارکان پاکستانی خواتین کے ہرگز نمائندہ نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض مرد اور عورتیں سرکاری ملازم ہیں، بعض کو مرد ارکان اسمبلی نے چُنا ہے اور بعض ایسی ہیں جو محض انگریزی اخبار نویس یا تعلیم گاہ کی صدر معلّمہ ہیں۔ پاکستان کی کسی مسلمان خاتون کو اگر نکاح یا طلاق یا وراثت یا حضانت کا کوئی خانگی مسئلہ درپیش ہو، تو وہ اس کمیٹی کے کسی ممبر کی طرف ہرگز رہنمائی کے لیے رجوع نہیں کرے گی۔ ایسی غیر نمائندہ اور نااہل کمیٹی کو آخر یہ حق کس طرح دیا جاسکتا ہے کہ وہ مسلم خواتین کے ازدواجی معاملات میں مداخلت کرے اور انہیں اس راہ پر لے جانے کی کوشش کرے جس پر وہ جانے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ اس طرح کی ایک ناکام اور نامعقول سعی ایوب خاں صاحب نے بھی کی تھی اور ۱۹۶۱ء میں فیملی لاز آرڈی ننس بنایا تھا جس کی رہی سہی کسر

اب موجودہ حکومت کی مقرر کردہ کمیٹی پوری کر رہی ہے۔

ہمارے فقہاء نے طلاق کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے ضمناً یہ بات بھی لکھ دی ہے کہ اگر خاوند بیوی کو طلاق کا حق تفویض کر دے اور یوں کہہ دے کہ تو جب چاہے میری طرف سے اپنے اُوپر طلاق وارد کر سکتی ہے اور عورت اس تفویض کو قبول کر لے تو عورت اپنا یہ حق استعمال کر سکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایوب خاں صاحب کے مارشل لا میں جن لوگوں نے عائلی قوانین مرتب کیے تھے انہیں یہ نکتہ کہیں سے ہاتھ لگ گیا اور انہوں نے نکاح کی رجسٹریشن کے لیے جو فارم مقرر کیا اس میں اس سوال کو باقاعدہ طور پر درج کر دیا گیا کہ عورت کو نکاح کے وقت حقِ طلاق تفویض کیا گیا یا نہیں؟ یہ گویا ہر عورت کو یہ سمجھانا تھا کہ تم نکاح کے وقت اس حق کا مطالبہ کرو۔ اور اسے حاصل کر کے جب چاہو بلا تامل استعمال کرو۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے مسلم معاشرے کا بگاڑ اپنی آخری حد کو نہیں پہنچا۔ یہ قانون جوں کا توں موجود ہے لیکن نکاح کا فارم پُر کرتے وقت بالعموم اس تفویض طلاق والی شق کو قلم زن کر دیا جاتا ہے اور کوئی دلہن یا اس کا ولی اس بدعت کو پسند نہیں کرتا کہ طلاق کی باگ ڈور خاوند سے چھین کر بیوی کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ پاکستان کی مسلمان خواتین کا تفویضِ طلاق کے حق کو مانگنے کی کوشش نہ کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اللہ کے فضل سے ابھی تک اسلامی اقدار کا پاس اور لحاظ رکھتی ہیں۔ اور ان کی عائلی زندگی میں شریعت نے حقوق و واجبات کی جو ترتیب و تحدید مقرر فرما دی ہے وہ اس سے تجاوز کرنا نہیں چاہتیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ "آزادیٔ نسواں" کے وکیلوں اور حامیوں نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا اور وہ برابر اس بات پر مُصر ہیں کہ وہ مرد اور عورت کے مابین مودّت و موافقت کے بجائے مسابقت، طبقاتی کشمکش اور منافرت کی فضا پیدا کریں۔

ایوب خاں نے اپنے ۱۹۶۱ء والے عائلی قانون کے ذریعے سے مرد کی طلاق کو عدالتی کارروائی پر معلق کرنے کی کوشش کی تھی۔ مزید برآں اس عائلی قانون کی دفعہ ۸ میں محض یہ گنجائش پیدا کی گئی تھی کہ جس بیوی کو خاوند نے حقِ طلاق تفویض کر دیا ہو۔ وہ عورت اس آرڈیننس کی دفعہ ۸ کے تحت اس حق کو استعمال کر سکے گی۔ مگر اب جو تجویز پیش کی جا رہی ہے اس کی رُو سے ہر عورت، خواہ اُسے خاوند نے حقِ طلاق تفویض کیا ہو یا نہ کیا ہو، بلا شرط و امتیاز یہ نام نہاد حق استعمال کر سکے گی اور جب وہ تنسیخ نکاح کا پروانہ عدالت سے (باقی بر صفحہ ۳۹)

سنہ ۶ بعد بعثت سے سنہ ۱۰ بعد بعثت تک

(۳)

سفر طائف | اس ضمنی، مگر موقع کے لحاظ سے ضروری بحث کے بعد اب ہم پھر سلسلۂ واقعات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اپنے خانگی معاملات سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بروایت ابن سعد و بلاذری شوال سنہ ۱۰ بعد بعثت کے آخر میں طائف کا رُخ کیا جو مکہ سے ۵۰ میل شرقاً واقع ہے۔ اس سفر کا سبب یہ تھا کہ قریش کی اذیت رسانیوں سے آپ تنگ آگئے تھے۔ اُن کی شدید مخالفت و مزاحمت دیکھ کر یہ اُمید نہیں رہی تھی کہ یہ لوگ دعوتِ حق کو قبول کرنا تو درکنار، اُسے جاری رکھنے کی بھی کوئی گنجائش آپ کے لیے باقی رہنے دیں گے۔ اس لیے آپ چاہتے تھے کہ طائف کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں، اور وہاں کے طاقت ور قبیلے، بنی ثقیف کو کم از کم اس بات پر آمادہ کرلیں کہ وہ آپ کو اپنے ہاں پناہ دے اور دعوتِ اسلامی کے کام میں آپ کی مدد اور حمایت کرے۔ ابن سعد نے جُبیرؓ بن مُطعِم بن عَدِی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اس سفر میں آپؐ کے ساتھ حضرت زیدؓ بن حارثہ گئے تھے۔ یہی ابن قُتیبہ اور بَلاذُری کا بھی بیان ہے۔ لیکن موسٰی بن عُقبہ اور ابن اسحاق کہتے ہیں کہ آپ تنہا تشریف لے گئے تھے۔ یہ سفر آپ نے پیدل کیا، کوئی سواری آپ کو میسّر نہ تھی۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ وہاں آپ دس دن ٹھیرے۔ مگر حافظ سخاوی کہتے ہیں کہ بیس دن تک آپ طائف کے دوسرے لوگوں سے ملتے رہے اور دس دن عبدِ یالیل سے ملنے کے بعد ٹھیرے۔ ابن قیتبہ نے بھی طائف کے قیام کی مدت ایک مہینہ بتائی ہے۔

اہل طائف کا آپ پر ظلم عظیم | ابن اسحاق اور واقدی وغیرہ کا بیان ہے کہ طائف کی سرداری اس وقت عمرو بن عُمیر بن عوف کے تین لڑکوں، عبدِ یالیل، مسعود اور حَبیب کے ہاتھ میں تھی، جن میں سے ایک کے گھر میں قریش کی ایک عورت صَفیّہ بنت مَعمر جُمحی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ملے، ان کو اللہ کی طرف دعوت دی اور ان سے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ اسلام کے کام میں میری مدد کریں، اور میری قوم

کے جو لوگ میری مخالفت کر رہے ہیں اُن کے مقابلے میں آپ لوگ میری حمایت کریں ۔ اس پر ان میں سے ایک نے کہا کہ " میں کعبے کے پردے نوچ ڈالوں گا اگر اللہ نے تم کو رسول بنایا ہے " ۔ دوسرے نے کہا " کیا خدا کو تمھارے سوا کوئی رسول بنانے کے لیے نہیں ملا ؟ " تیسرے نے کہا " میں تم سے ہرگز بات نہیں کروں گا ۔ کیونکہ اگر تم واقعی اللہ کے رسول ہو تو تم اِس سے بزرگ تر ہو کہ میں تمہاری بات کا جواب دوں ۔ اور اگر تم اللہ کا نام لے کر جھوٹ بول رہے ہو تو اِس قابل نہیں ہو کہ تم سے بات کی جائے " ۔ یہ جواب سُن کر حضورؐ اُٹھ گئے اور آپ کو اُن سے کسی بھلائی کی توقع باقی نہیں رہی ۔ چلتے ہوئے آپ نے ان سے کہا کہ " خیر ، جو کچھ برتاؤ تم نے مجھ سے کیا سو کیا ، مگر کم از کم اِتنا کرو کہ میری بات کو مخفی رکھو " ۔ یہ بات آپ نے اس لیے فرمائی کہ آپ کو اندیشہ تھا کہ اگر قریش تک یہ خبر پہنچے گی تو وہ اور جری ہو جائیں گے ۔ مگر انھوں نے ایسا نہ کیا اور اپنے لُچّوں لفنگوں اور غلاموں کو آپ کے خلاف ہُشکار دیا ، اور وہ آپ کو گالیاں دینے اور آپ پر آوازے کسنے لگے ، یہاں تک کہ لوگ اکٹھے ہو گئے اور آپ کو ایک باغ کی دیوار تک پہنچا کر چھوڑا جو عُتْبہ بن رَبیعہ اور شَیبَہ بن رَبیعہ کا تھا ۔

واقدی سے ابن سعد کی روایت میں یہ ہے کہ آپ ثَقِیف کے اشراف و رؤسا میں سے ایک ایک کے پاس گئے مگر کسی نے آپ کی بات نہ مانی ۔ بلکہ انہیں یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں آپ اُن کے نوجوانوں کو " بگاڑ " نہ دیں ، اس لیے انہوں نے کہا " اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ، تم ہمارے شہر سے نکل جاؤ اور زمین میں تمہارے جو دوست بھی ہوں ، اُن سے جا ملو " ۔ پھر انہوں نے اپنے اَوباشوں اور غلاموں کو آپ کے خلاف اُکسایا اور انہوں نے آپ کو گالیاں دیں ، اور شور مچا کر لوگوں کو اکٹھا کر لیا ۔ موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے تاک تاک کر آپ کے ٹخنوں اور ایڑیوں پر پتھر مارے ۔ راستے کے دونوں جانب وہ صفیں بنائے کھڑے تھے ، اور جیسے جیسے آپ قدم اُٹھا کر چلتے جاتے تھے ، وہ سنگ باری کرتے جاتے تھے ، یہاں تک کہ آپ کی جُوتیاں خون سے بھر گئیں ۔ سلیمان التیمی کا بیان ہے کہ چوٹوں کی تکلیف سے جب آپ بیٹھ جاتے تو وہ آپ کو کھڑا کر دیتے تاکہ آپ پر پھر پتھر برسائیں ۔ چنانچہ جب آپ مجبوراً چلنا شروع کرتے تو وہ پتھر مارتے اور ٹھٹھے لگاتے تھے ۔ واقدی کی روایت ابن سعد نے نقل کی ہے کہ اس موقع پر حضرت زیدؓ بن حارثہ آپ کو پتھروں سے بچانے کے لیے خود پتھروں کی بارش اپنے اوپر لیتے رہے یہاں تک کہ ان کا سر پھٹ گیا ۔

حضورؐ کی رقت انگیز دُعا | آخر کار حضورؐ جب طائف سے نکل گئے ، اور وہ بدمعاش لوگ جو آپ کا تعاقب کر رہے تھے واپس ہو گئے تو آپ زخموں سے چُور عُتبَہ اور شَیبَہ کے باغ کی دیوار سے لگ کر انگور کی ایک بیل

کے سایے میں بیٹھ گئے۔ اس موقع پر آپ کا دل بھر آیا اور آپ نے اپنے رب کی طرف رجوع کر کے دُعا کی جس کے یہ رقت انگیز الفاظ طبرانی نے کتاب الدعاء اور معجم کبیر میں، ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے سیرت میں، طبری نے تاریخ میں، ابن القیم نے زاد المعاد میں اور حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں نقل کیے ہیں:

" خداوندا، میں تیرے ہی حضور اپنی بے بسی و بے چارگی اور لوگوں کی نگاہ میں اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین، تو سارے ہی کمزوروں کا رب ہے اور میرا رب بھی تو ہی ہے۔ مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے حوالے جو مجھ سے درشتی کے ساتھ پیش آئے؟ یا کسی دشمن کے حوالے جس کو تو نے مجھ پر قابو پالینے کا اقتدار دے دیا ہے؟ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی مصیبت کی پروا نہیں۔ مگر تیری طرف سے عافیت مجھے نصیب ہو جائے تو اس میں میرے لیے زیادہ کشادگی ہے۔ میں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے اُس نور کی جو اندھیرے میں اجالا کرتا اور دنیا و آخرت کے معاملات کو درست کرتا ہے۔ مجھے اس سے بچا لے کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہو یا میں تیرے عتاب کا مستحق ہو جاؤں۔ تیری مرضی پر راضی ہوں یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔ کوئی زور اور طاقت تیرے بغیر نہیں۔"

حضورؐ کی شانِ رحمۃ للعالمینی بخاری نے بدءُ الخلق، ذکر الملائکہ میں، مسلم نے مغازی میں اور نسائی نے نُعوت میں حضرت عائشہؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ انہوں نے حضورؐ سے پوچھا "کیا آپ پر اُحد کے معرکے سے بھی زیادہ سخت وقت کوئی آیا ہے؟" آپ نے جواب میں طائف کے واقعہ کا ذکر کیا اور فرمایا کہ "میں غم زدہ حالت میں جدھر منہ اُٹھا چل پڑا (یعنی حیران تھا کہ کدھر جاؤں)۔ ابھی میں نے اپنی اِس حالت سے افاقہ بھی نہ پایا تھا کہ یکایک میں نے دیکھا کہ میں قرن الثعالب[1] کے مقام پر ہوں۔ اُوپر نگاہ اُٹھائی تو دیکھا کہ ایک ابر میرے اُوپر سایہ کیے ہوئے ہے۔ پھر دیکھا کہ اس میں جبریل ہیں۔ انہوں نے پکار کر مجھ سے کہا کہ "اللہ نے وہ سب کچھ سن لیا ہے جو آپ کی قوم نے آپ سے کہا اور آپ کی دعوت کا جو جواب آپ کو دیا۔ یہ پہاڑوں کا فرشتہ اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے تاکہ آپ جو چاہیں اِسے حکم دیں"۔ پھر پہاڑوں کے فرشتے نے پکار کر مجھے سلام کیا، اور اس کے بعد مجھ سے کہا کہ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، اللہ نے آپ کی قوم کا قول اور آپ کی دعوت پر اُس کا جواب

[1] اس مقام کو قرن المنازل بھی کہتے ہیں۔ یہ اہل نجد کی میقات ہے جہاں سے اُن کو احرام باندھنا ہوتا ہے اور یہ مکہ سے اونٹ کی سواری پر یک شبانہ روز کی مسافت پر ہے۔

سُن لیا ہے۔ میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں، مجھے آپ کے رب نے آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ آپ اپنا حکم مجھے دیں (یہ مسلم کی روایت کے الفاظ ہیں۔ طبرانی میں ہے کہ جو حکم آپ چاہیں دیں، اور بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ پھر اس نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، آپ کو اختیار ہے جو کچھ بھی آپ چاہیں) اگر آپ چاہیں تو میں اُن پر (یعنی قریش پر)، مکہ کے دو طرفہ پہاڑوں (یعنی ابوقُبَیس اور قُعَیقِعان) کو ایک ساتھ ملا کر ڈھانک دوں[1]۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب یہ دیا کہ "نہیں، میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ اُن کی پُشتوں سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اللہ وحدہٗ لا شریک کی عبادت کریں گے"۔

عَدّاس نصرانی کا قبولِ اسلام

ابن ہشام نے ابن اسحاق کا بیان نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخموں سے چُور ہو کر عُتبہ بن ربیعہ اور شَیبہ بن ربیعہ کے باغ کی دیوار سے لگ کر انگور کی بیل کے سایے میں بیٹھے ہوئے تھے، تو قریش کے ان دونوں سرداروں نے آپ کو اس حالت میں دیکھا اور اُن کی رگِ حمیت کو اس پر کچھ جوش آیا۔ یہ بھی مذکور ہوا ہے کہ بنی جُمَح کی جو عورت طائف کے سرداروں میں سے ایک کے گھر میں تھی وہ بھی حضورؐ سے ملی اور آپ نے اس سے فرمایا کہ "تمہاری سسرال والوں نے یہ کیسا سلوک ہمارے ساتھ کیا"۔ عُتبہ اور شَیبہ نے اپنے ایک عیسائی غلام عَدّاس کو بلایا اور اس سے کہا کہ "انگوروں کا ایک خوشہ طباق میں رکھ کر اس شخص کے پاس لے جا اور اس سے کہہ کہ اسے کھا لے"۔ اس نے جب طباق لے جا کر آپ کے سامنے رکھا اور آپ سے تناول فرمانے کے لیے کہا تو آپ نے بسم اللہ کہہ کر (ایک روایت میں ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر) اُس میں ہاتھ ڈالا۔ عَدّاس بولا "خدا کی قسم اِس ملک میں تو کوئی یہ کلمہ کہنے والا نہیں ہے"۔ حضورؐ نے پوچھا "تم کہاں کے رہنے والے ہو اور تمہارا دین کیا ہے"؟ اس نے کہا "میں عیسائی ہوں، نینَویٰ کا رہنے والا ہوں"۔ آپ نے فرمایا "مردِ صالح یونسؑ بن مَتّٰی کی بستی کے ہو"؟ اس نے پوچھا آپ اُن کو کیسے جانتے ہیں[2]؟ فرمایا "وہ میرے بھائی

---

[1] قریش پر پہاڑوں کو ڈھانک دینے کے لیے فرشتے نے اس وجہ سے آپ کا اذن طلب کیا کہ طائف میں جو مصیبت آپ پر پیش آئی وہ اُنھی کے ظلم و عناد کے باعث ہی پیش آئی تھی۔ اگر وہ آپ کو حد سے زیادہ تنگ نہ کرتے تو آپ کے طائف تشریف لے جانے کی نوبت ہی کیوں آتی۔

[2] سُہیلی نے التَّیمی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضور کی زبان مبارک سے حضرت یونسؑ کا ذکر سن کر عَدّاس نے کہا "خدا کی قسم میں نے جب نینوی چھوڑا تھا اس وقت وہاں دس آدمی بھی یہ جاننے والے نہ تھے کہ مَتّٰی کیا ہے۔ پھر آپ ان کو کیسے جانتے ہیں، حالانکہ آپ امّی ہیں اور امّی قوم میں پیدا ہوئے ہیں؟

ہیں۔ وہ بھی نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں۔" یہ سنتے ہی عدّاس آپ پر جھکا اور آپ کے سر اور ہاتھوں اور قدموں کو چومنے لگا۔ سلیمان التیمی نے اپنی کتاب سیرت میں لکھا ہے کہ عدّاس نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ ربیعہ کے بیٹوں نے جب یہ منظر دیکھا تو ایک نے دوسرے سے کہا، "لو بھئی تمہارے غلام کو بھی اس شخص نے بگاڑ دیا۔" عدّاس واپس آیا تو انہوں نے کہا "یہ تجھے کیا ہو گیا کہ اس شخص کا سر اور ہاتھ اور پاؤں چومنے لگا؟" اس نے جواب دیا "میرے آقا، زمین میں ان سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ انہوں نے مجھے ایک ایسی چیز کی خبر دی جس کو نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔" انہوں نے کہا "عدّاس اپنے دین سے نہ پھر۔ تیرا دین اس کے دین سے بہتر ہے۔"

جنوں کا قرآن سننا

طائف سے واپسی پر آپ چند روز نخلہ کے مقام پر جا کر ٹھہر گئے۔ پریشان تھے کہ اب کیسے مکہ واپس جاؤں۔ طائف میں جو کچھ گذری ہے اس کی خبریں وہاں پہنچ چکی ہوں گی۔ اس کے بعد تو کفار پہلے سے بھی زیادہ دلیر ہو جائیں گے۔ انہی ایام میں ایک روز رات کو آپ نماز میں قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنوں کے ایک گروہ کا اُدھر سے گذر ہوا۔ انہوں نے قرآن سنا، ایمان لائے، واپس جا کر اپنی قوم میں اسلام کی تبلیغ شروع کر دی، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی نبی کو یہ خوشخبری سنائی کہ انسان چاہے آپ کی دعوت سے بھاگ رہے ہوں، مگر بہت سے جن اس کے گرویدہ ہو گئے ہیں اور وہ اسے اپنی جنس میں پھیلا رہے ہیں[1]۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت حسن بصری، سعید بن جُبیر، زِرّ بن حُبَیش، مجاہد، عِکرِمہ اور دوسرے بزرگوں سے جنوں کی آمد کی جو روایات مروی ہیں وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ جنوں کی حاضری کا یہ واقعہ بَطنِ نَخلہ میں پیش آیا تھا۔ ابن اسحاق، ابو نُعَیم اصفہانی اور واقدی کا بیان ہے کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے مایوس ہو کر مکہ معظمہ کی طرف واپس ہو رہے تھے۔ راستہ میں آپ نے نخلہ میں قیام کیا۔ وہاں عشاء یا فجر یا تہجد کی نماز میں آپ قرآن کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنوں کے ایک گروہ کا ادھر سے گذر ہوا اور وہ آپ کی قرأت سننے کے لیے ٹھہر گیا۔ اس کے ساتھ تمام روایات اس بات پر بھی متفق ہیں کہ اس موقع پر جن حضورؐ کے سامنے نہیں آئے تھے۔ نہ آپ نے ان کی

---

[1] یہ سورۂ احقاف کی آیات ۲۹ تا ۳۲ تھیں جن میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی تھی کہ اس وقت جنوں نے آپ سے قرآن سنا اور اس سے کیا اثر لیا۔

آمد کو محسوس فرمایا تھا۔ بلکہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے آپ کو ان کے آنے اور قرآن سننے کی خبر دی۔

یہ مقام جہاں یہ واقعہ پیش آیا، یا تو الزَّیمہ تھا یا السَّیل الکبیر، کیونکہ یہ دونوں مقام وادی نخلہ میں واقع ہیں، دونوں جگہ پانی اور سرسبزی موجود ہے اور طائف سے آنے والوں کو اگر اس وادی میں پڑاؤ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ انہی دونوں میں سے کسی جگہ ٹھیر سکتے ہیں۔

اس موقع پر جنوں نے حضورؐ کی زبان مبارک سے قرآن کی جو سورت سنی وہ سورۂ رحمٰن تھی۔ البزّار، ابن جریر، ابن المنذر، دارقطنی (فی الافراد) ابن مردویہ، اور الخطیب (فی التاریخ) نے حضرت عبداللہؓ بن عمر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ رحمٰن خود تلاوت فرمائی، یا آپ کے سامنے یہ سورۃ پڑھی گئی۔ پھر آپ نے لوگوں سے فرمایا "کیا وجہ ہے کہ میں تم سے ویسا اچھا جواب نہیں سن رہا ہوں جیسا جنوں نے اپنے رب کو دیا تھا؟" لوگوں نے عرض کیا وہ کیا جواب تھا؟ آپ نے فرمایا "جب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ پڑھتا تو جن اس کے جواب میں کہتے لَا بِشَیْءٍ مِّنْ نِعْمَۃِ رَبِّنَا نُکَذِّبُ۔ "ہم اپنے رب کی کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے"۔ اسی سے ملتا جلتا مضمون ترمذی، حاکم اور حافظ ابو بکر بزّار نے حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے نقل کیا ہے۔ ان کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جب لوگ سورۂ رحمٰن کو سن کر خاموش رہے تو حضورؐ نے فرمایا "میں نے یہ سورت اُس رات جنوں کو سنائی تھی جس میں وہ قرآن سننے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ وہ اس کا جواب تم سے بہتر دے رہے تھے۔ جب میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر پہنچتا تھا کہ اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے تو وہ اس کے جواب میں کہتے تھے لَا بِشَیْءٍ مِّنْ نِعَمِکَ رَبَّنَا نُکَذِّبُ فَلَکَ الْحَمْدُ " اے ہمارے پروردگار، ہم تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے، تعریف تیرے ہی لیے ہے"۔ اگرچہ دوسری روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم نہ تھا کہ جن آپ سے قرآن سن رہے ہیں، بلکہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے (سورۂ احقاف کی آیات ۲۹-۳۲ میں) آپ کو یہ خبر دی کہ وہ آپ کی تلاوت سن رہے تھے۔ لیکن یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ جس طرح اللہ نے حضورؐ کو جنوں کی سماعتِ قرآن پر مطلع فرمایا تھا اُسی طرح اللہ ہی نے آپ کو یہ اطلاع بھی دے دی ہو کہ سورۂ رحمٰن سنتے وقت وہ اس کا کیا جواب دیتے جا رہے تھے۔

واپسی پر مکہ میں حضورؐ کا داخلہ کس طرح ہوا؟ ابن سعد نے واقدی کی روایت نقل کی ہے کہ نخلہ سے جب آپؐ نے

مکہ تشریف لے جانے کا قصد فرمایا تو حضرت زیدؓ بن حارثہ نے عرض کیا کہ آپ وہاں کیسے داخل ہوں گے جب کہ قریش آپ کو نکال چکے ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا کہ "اے زید، جو حالات تم دیکھ رہے ہو اُن سے نکلنے کے لیے اللہ کوئی راستہ پیدا کرے گا۔ وہ اپنے دین کا حامی و ناصر ہے اور اپنے نبی کو غالب کرنے والا ہے۔" آگے کی بات واقدی نے مختصر کر دی ہے مگر ابن اسحاق نے اس کو مفصل بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حرا پہنچ کر آپؐ نے عبداللہ بن اُرَیقِط[لہ] کو اَخنَس بن شَرِیق کے پاس بھیجا تا کہ وہ آپ کو اپنی پناہ میں لے۔ اُس نے کہا میں تو حلیف ہوں[لہ] اور حلیف قریش کے اصل قبیلوں کے مقابلہ میں پناہ نہیں دے سکتا۔ پھر آپ نے ابن اُرَیقِط کو سُہَیل بن عَمرو کے پاس بھیجا۔ اس نے کہا بنی عامر بن لُوَیّ بنی کعب کے مقابلہ میں پناہ نہیں دے سکتے۔ اس کے بعد آپؐ نے اُس کو مُطعِم بن عَدِی کے پاس بھیجا جو بنی عبد مَناف کی شاخ بنی نَوفَل میں سے تھا۔ اُریقط نے اس سے جا کر کہا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم سے کہتے ہیں کہ کیا تم مجھے پناہ دینے کے لیے تیار ہو تا کہ میں اپنے رب کے پیغامات پہنچا سکوں؟" اس نے جواب دیا ہاں، وہ مکہ میں آجائیں۔ چنانچہ حضورؐ شہر میں تشریف لے گئے اور رات اس کے ہاں رہے۔ صبح ہوئی تو مطعم اور اس کے چھ سات بیٹے مسلح ہو کر آپ کو اپنے ساتھ حرم میں لے گئے اور کہا کہ آپ طواف کریں۔ طواف کے دوران میں وہ سب آپ کی حفاظت کے لیے کھڑے رہے۔ ابوسُفیان نے (طَبَری کی روایت میں یہ ہے کہ ابوجہل نے) پوچھا "پناہ دینے والے ہو یا ان کی پیروی اختیار کر لی ہے؟" مطعم نے کہا، "نہیں بلکہ پناہ دینے والا ہوں۔" اس نے کہا "تمہاری پناہ کو نہیں توڑا جا سکتا، جسے تم نے پناہ دی اُسے ہم نے پناہ دی۔"

مطعم بن عدی کا یہی احسان تھا جس کی بنا پر حضورؐ نے جنگِ بدر کے قیدیوں کے متعلق فرمایا تھا کہ لو کان

لہ یہ شخص اگرچہ مشرک تھا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اس کو قابلِ اعتماد آدمی سمجھتے تھے۔ اسی لیے مدینے کی طرف ہجرت کے انتہائی خطرناک موقع پر بھی آپ نے راستہ بتانے کے لیے اُسی کو ساتھ لیا تھا، اور اس نے پوری وفاداری کے ساتھ آپ کی یہ خدمت انجام دی تھی، حالانکہ قریش کو آپ کے سفر اور راستہ کی خبر دے کر وہ بھاری انعام وصول کر سکتا تھا۔

لہ یہ شخص دراصل بنی ثَقِیف میں سے تھا، لیکن مکہ میں بنی زُہرہ (حضورؐ کی ننھیال) کے ساتھ اس کے حلیفانہ تعلقات تھے، اور اس کی قابلیت کی وجہ سے بنی زہرہ میں اس کو سرداری کا مقام حاصل تھا۔

المطعم بن عدی حیاً ثم کلمنی فی ھؤلاء النتنٰی لترکتھم لہ (بخاری، ابوداؤد، مسند احمد) - یعنی "اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور مجھ سے اِن گھناؤنے لوگوں کے متعلق بات کرتا تو میں اُس کی خاطر انہیں چھوڑ دیتا"۔

باب (۱۱)

اِسراء و معراج

اب قبل اس کے کہ ہم مکّے کے آخری تین سالوں کی تاریخ بیان کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے سب سے اہم واقعہ کو تفصیل کے ساتھ پیش کر دیا جائے جو حضورؐ انور کی سیرتِ پاک پر ایک مرصّع تاج کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا ہے، ایسا تاج جس سے انبیاء سمیت تاریخ انسانی کے کسی فرد کی سیرت بھی مزیّن نہیں ہوئی ہے۔ یہ ہے واقعۂ اِسراء و معراج۔ اِسراء سے مراد ہے رات کے وقت آپ کو مسجد حرام سے مسجد اقصٰی (بیت المقدس) تک لے جانا، جیسا کہ قرآن مجید، سورۂ بنی اسرائیل کے آغاز میں بیان ہوا ہے۔ اور معراج سے مراد ہے آپ کا بیت المقدس سے سِدرۃ المنتہٰی تک پہنچنا، جس کی پوری تفصیلات احادیث میں بیان ہوئی ہیں۔ اگرچہ بعض شاذ اقوال یہ بھی ہیں کہ اِسراء اور معراج کے واقعات الگ الگ اوقات میں پیش آئے ہیں، لیکن علمائے اُمت، فقہاء، محدثین اور متکلّمین کی عظیم اکثریت اِس بات پر متفق ہے کہ یہ دونوں واقعات بیک وقت پیش آئے تھے۔ ایک ہی رات آپ کو جسم و رُوح کے ساتھ بحالتِ بیداری مسجدِ حرام سے بیت المقدس بھی لے جایا گیا اور اسی رات آپ عالمِ بالا کی انتہائی بلندیوں سے گزرتے ہوئے بارگاہ رب العزّت تک بھی پہنچے، اور صبح ہونے سے پہلے مکّہ واپس بھی تشریف لے آئے۔

معراج کی تاریخ یہ واقعہ کب پیش آیا؟ اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ ابن سعد نے واقدی کی روایت نقل کی ہے کہ یہ ۱۷ رمضان ۱۲ سنہ بعد بعثت کو یعنی ہجرت سے ۱۸ مہینے پہلے پیش آیا[۱]۔ دوسری سند سے

---

[۱] یہاں یہ امر واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہجرت الی المدینہ سے پہلے بعد بعثت کی جو تاریخیں (باقی برصفحہ ۱۷)

ابن سعد ہی نے اسے ۱۷ ربیع الاول ۱۳ھ بعد بعثت، یعنی ہجرت سے ایک سال قبل کا واقعہ بیان کیا ہے۔ بیہقی نے موسیٰ بن عُقبہ کے حوالہ سے اور انہوں نے امام زُہری کے حوالہ سے بھی معراج کی یہی تاریخ بیان کی ہے، اور یہی عُروہ بن زبیر کی روایت ہے جسے ابن لَہِیعہ نے ابوالاَسود کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ اسی بنا پر امام نَوَوی نے اسی کو معراج کی صحیح تاریخ کہا ہے، اور ابن حزم نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے، اگرچہ یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ اسماعیل السُّدِّی سے اس کے بارے میں دو قول منقول ہوئے ہیں۔ طَبَری و بَیہقی نے ان کی جو روایت نقل کی ہے اس میں وہ معراج کو ہجرت سے ایک سال پانچ مہینے پہلے یعنی شوال ۱۲ھ بعد بعثت کا واقعہ بیان کرتے ہیں، اور حاکم کی روایت ایک سال ۳ مہینے قبل کی ہے جس کی رو سے یہ ماہ ذی القعدہ کا واقعہ قرار پاتا ہے۔ ابن عبدالبَرّ اور ابن قُتَیبہ کا بیان ہے کہ یہ ہجرت سے ایک سال ۸ مہینے پہلے (یعنی رجب ۱۲ھ بعد بعثت) کا واقعہ ہے۔ ابن فارِس نے اسے ہجرت سے ایک سال تین مہینے قبل کا، ابن الجوزی نے ۸ مہینے قبل کا، اور ابوالرَّبیع بن سالم نے ۶ مہینے قبل کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اور ایک قول ۱۱ مہینے قبل کا بھی ہے جسے ابن المُنیر نے سیرتِ ابن عبدالبَرّ کی شرح میں ترجیح دی ہے اور ابراہیم بن اسحاق الحَربی نے قطعیت کے ساتھ کہا ہے کہ یہی معراج کی تاریخ ہے۔ لیکن مشہور یہ ہے کہ معراج ۲۷ رجب کو ہوئی تھی، اور علامہ زُرقانی کی رائے یہ ہے کہ جب کسی قول کو دوسرے قول پر ترجیح دینے کے لیے کافی دلائل موجود نہیں ہیں تو مشہور قول ہی کو اختیار کر لینا بہتر ہے۔

تاریخی پسِ منظر یہ واقعہ تحریکِ اسلامی کے اُس مرحلے میں پیش آیا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو توحید کی آواز بلند کرتے ہوئے تقریباً ۱۲ سال گزر چکے تھے۔ آپ کے مخالفین آپ کا راستہ روکنے کے لیے سارے جتن کر چکے تھے، مگر ان کی مزاحمتوں کے باوجود آپ کی آواز عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی تھی۔ عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جس میں دو چار آدمی آپ کی دعوت سے متاثر نہ ہو چکے ہوں۔ خود مکے میں ایسے مخلص لوگوں کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) متعین کرتے ہیں وہ اس حدیث پر مبنی ہیں جو بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوئی اُس وقت آپ چالیس سال کے تھے اس کے بعد آپ ۱۳ سال مکہ میں رہے، اور ۱۰ سال مدینے میں۔ اس روایت کی بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہجرت ۱۳ھ بعد بعثت کے اختتام پر ہوئی۔

ایک مختصر جتھا بن چکا تھا جو اس دعوتِ حق کی کامیابی کے لیے ہر خطرہ انگیز کر جانے کو تیار تھے۔ مدینے میں اوس اور خزرج کے طاقتور قبیلوں کی بڑی تعداد آپ کی حامی بن چکی تھی۔ اب وہ وقت قریب آلگا تھا جب آپ کو مکے سے مدینے کی طرف منتقل ہو جانے اور منتشر مسلمانوں کو ایک جگہ سمیٹ کر اسلام کے اصولوں پہ ایک معاشرہ اور ریاست قائم کر دینے کا موقع ملنے والا تھا۔ ان حالات میں معراج پیش آئی اور واپسی پر وہ پیغام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو سنایا جو سورۂ بنی اسرائیل میں درج ہے۔

واقعہ کا مجمل بیان

سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں صرف مسجدِ حرام (یعنی بیت اللہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک حضورؐ کو لے جانے کی تصریح کی گئی ہے، اور اس کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اپنی کچھ نشانیاں دکھانا چاہتا تھا۔ اس سے زیادہ کوئی تفصیل قرآن میں نہیں بتائی گئی۔ لیکن حدیث اور سیرت کی کتابوں میں اس واقعہ کی تفصیلات بکثرت صحابہ سے مروی ہیں جن کی تعداد ۲۵ تک (بلکہ مزید استقصاء کرنے سے ۴۵ تک) پہنچتی ہے۔ ان میں سے مفصل ترین روایات حضرت انسؓ بن مالک، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت مالکؓ بن صعصعہ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت شدادؓ بن اوس، حضرت عبداللہؓ بن عباس، حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت امّ ہانیؓ سے مروی ہیں۔

حدیث میں جو تفصیلات آئی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ رات کے وقت جبریل علیہ السلام آپ کو اٹھا کر مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک براق پر لے گئے۔ وہاں آپ نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز ادا کی۔ پھر وہ آپ کو عالمِ بالا کی طرف لے چلے اور وہاں مختلف طبقاتِ سماوی میں مختلف جلیل القدر انبیاء سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ آخر کار آپ انتہائی بلندیوں پہ پہنچ کر اپنے رب کے حضور حاضر ہوئے اور اس حضوری کے موقع پہ دوسری اہم ہدایات کے علاوہ آپ کو پنج وقتہ نماز کی فرضیت کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد آپ بیت المقدس کی طرف پلٹے اور وہاں سے مسجد حرام واپس تشریف لے آئے۔ اس سلسلہ میں بکثرت روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو جنت اور دوزخ کا بھی مشاہدہ کرایا گیا۔ نیز معتبر روایات یہ بھی بتاتی ہیں کہ دوسرے روز جب آپ نے اس واقعہ کا لوگوں سے ذکر کیا تو کفار مکہ نے اس کا بہت مذاق اڑایا اور مسلمانوں میں سے بھی بعض کے ایمان متزلزل ہو گئے۔

حدیث کی یہ زائد تفصیلات قرآن کے خلاف نہیں بلکہ اس کے بیان پہ اضافہ ہیں اور ظاہر ہے کہ اضافے کو قرآن کے خلاف کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا۔

معراج جسمانی تھی یا روحانی

معراج کے اس سفر کی کیفیت کیا تھی؟ یہ عالم خواب میں پیش آیا تھا یا بیداری میں؟ اور آیا

حضورؐ بذاتِ خود تشریف لے گئے تھے یا اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے محض روحانی طور پہ ہی آپ کو یہ مشاہدہ کرا دیا گیا؟ ان سوالات کا جواب قرآن مجید کے الفاظ خود دے رہے ہیں۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی سے بیان کی ابتداء کرنا خود بتا رہا ہے کہ یہ کوئی بہت بڑا خارقِ عادت واقعہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت سے رُونما ہوا۔ ظاہر ہے کہ خواب میں کسی شخص کا اِس طرح کی چیزیں دیکھ لینا، یا کشف کے طور پہ دیکھنا یہ اہمیت نہیں رکھتا کہ اسے بیان کرنے کے لیے اِس تمہید کی ضرورت ہو کہ "تمام کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو یہ خواب دکھایا یا کشف میں یہ کچھ دکھایا"۔ پھر یہ الفاظ بھی "کہ ایک رات اپنے بندے کو لے گیا" جسمانی سفر پہ صریحاً دلالت کرتے ہیں۔ خواب کے سفر یا کشفی سفر کے لیے "لے جانے" کے الفاظ کسی طرح موزوں نہیں ہوسکتے۔ لہٰذا ہمارے لیے یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ یہ محض ایک روحانی تجربہ نہ تھا، بلکہ ایک جسمانی سفر اور عینی مشاہدہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کرایا۔

اب اگر ایک رات میں ہوائی جہاز کے بغیر مکہ سے بیت المقدس جانا اور آنا اللہ کی قدرت سے ممکن تھا تو آخر اُن دوسری تفصیلات ہی کو ناممکن کہہ کر کیوں رد کر دیا جائے جو حدیث میں بیان ہوتی ہیں۔ ممکن اور ناممکن کی بحث تو صرف اُس صورت میں پیدا ہوتی ہے جبکہ کسی مخلوق کے باختیار خود کوئی کام کرنے کا معاملہ زیرِ بحث ہو۔ لیکن جب ذکر یہ ہو کہ خدا نے فلاں کام کیا تو پھر امکان کا سوال وہی شخص اُٹھا سکتا ہے جسے خدا کے قادرِ مطلق ہونے کا یقین نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے آناً فاناً ایسی جگہ لے جاسکتا ہے جہاں عالمِ مادی کی سب سے تیز رفتار چیز یعنی روشنی کو پہنچنے میں بھی اربوں سالِ نوری درکار ہوتے ہیں۔ زمان و مکان کی قیود مخلوقات کے لیے ہیں، خالقِ کائنات کے لیے نہیں ہیں۔

منکرین حدیث کے اعتراضات سفرِ معراج کی جو تفصیلات حدیث میں آئی ہیں اُن پہ منکرین حدیث کی طرف سے متعدد اعتراضات کیے جاتے ہیں مگر ان میں سے صرف دو ہی ایسے ہیں جو کچھ وزن رکھتے ہیں۔

ایک یہ کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا کسی خاص مقام پہ مقیم ہونا لازم آتا ہے، ورنہ اس کے حضورؐ بندے کی پیشی کے لیے کیا ضرورت تھی کہ اسے سفر کرا کے ایک مقامِ خاص تک لے جایا جاتا؟

دوسرے یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دوزخ اور جنّت کا مشاہدہ اور بعض لوگوں کے مبتلائے عذاب ہوتے کا معائنہ کیسے کرایا گیا، جبکہ ابھی بندوں کے مقدمات کا فیصلہ ہی نہیں ہوا ہے؟ یہ کیا بات ہوئی کہ سزا و جزا کا فیصلہ تو ہونا ہے قیامت کے بعد اور کچھ لوگوں کو سزا دے ڈالی گئی ابھی سے۔

لیکن دراصل یہ دونوں اعتراض بھی قلتِ فکر کا نتیجہ ہیں۔ پہلا اعتراض اس لیے غلط ہے کہ خالق اپنی ذات میں تو بلاشبہ اطلاقی شان رکھتا ہے مگر مخلوق کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ اپنی کسی کمزوری کی بناء پر نہیں بلکہ مخلوق کی کمزوریوں کی بناء پر محدود وسائط اختیار کرتا ہے۔ مثلاً جب وہ مخلوق سے کلام کرتا ہے تو کلام کا وہ محدود طریقہ استعمال کرتا ہے جسے ایک انسان سن اور سمجھ سکے۔ حالانکہ بجائے خود اللہ کا کلام ایک اطلاقی شان رکھتا ہے۔ اسی طرح جب وہ اپنے بندے کو اپنی سلطنت کی عظیم الشان نشانیاں دکھانا چاہتا ہے تو اسے لے جاتا ہے اور جہاں جو چیز دکھانی ہوتی ہے اسی جگہ دکھاتا ہے، کیونکہ بندہ ساری کائنات کو بیک وقت اس طرح نہیں دیکھ سکتا جس طرح خدا دیکھتا ہے۔ خدا کو کسی چیز کے مشاہدے کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر بندے کو ہوتی ہے۔ یہی معاملہ خالق کے حضور باریابی کا بھی ہے کہ خالق بذاتِ خود کسی مقام پر متمکن نہیں ہے۔ مگر بندہ اس کی ملاقات کے لیے ایک جگہ کا محتاج ہے جہاں اس کے لیے تجلّیات کو مرکوز کیا جائے۔ ورنہ اس کی شانِ اطلاق میں اس سے ملاقات بندۂ محدود کے لیے ممکن نہیں ہے۔

رہا دوسرا اعتراض تو وہ اس لیے غلط ہے کہ معراج کے موقع پر بہت سے مشاہدات جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کرائے گئے تھے، ان میں بعض حقیقتوں کو مُمثّل کر کے دکھایا گیا تھا۔ مثلاً ایک فتنہ انگیز بات کی یہ تمثیل کہ ایک ذرا سے شگاف میں سے ایک موٹا سا بیل نکلا اور پھر اس میں واپس نہ جا سکا، یا زناکاروں کی یہ تمثیل کہ ان کے پاس تازہ نفیس گوشت موجود ہے مگر وہ اسے چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے ہیں۔ اسی طرح بُرے اعمال کی جو سزائیں آپؐ کو دکھائی گئیں وہ بھی تمثیلی رنگ میں عالمِ آخرت کی سزاؤں کا پیشگی مشاہدہ تھیں۔

اصل بات جو معراج کے سلسلے میں سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام میں سے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے اُن کے منصب کی مناسبت سے ملکوتُ السّمٰوٰت و الارض کا مشاہدہ کرایا ہے اور مادّی حجابات بیچ میں سے ہٹا کر آنکھوں سے وہ حقیقتیں دکھائی ہیں جن پر ایمان بالغیب لانے کی دعوت دینے پر وہ مامور کیے گئے تھے، تاکہ اُن کا مقام ایک فلسفی کے مقام سے بالکل ممیّز ہو جائے۔ فلسفی جو کچھ بھی کہتا ہے قیاس اور گمان سے کہتا ہے۔ وہ خود اگر اپنی حیثیت سے واقف ہو تو کبھی اپنی کسی رائے کی صداقت پر شہادت نہ دے گا۔ مگر انبیاء جو کچھ کہتے ہیں وہ براہ راست علم اور مشاہدے کی بناء پر کہتے ہیں۔ اور وہ خلق کے سامنے یہ شہادت دے سکتے ہیں کہ ہم ان باتوں کو جانتے ہیں اور یہ ہماری آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں۔ (باقی)

نمازِ دید

از جناب سید اسعد گیلانی صاحب

(جناب گیلانی صاحب آج کل زیارتِ حرمین شریفین کی سعادت سے مشرف ہو رہے ہیں۔ یہ مضمون انہوں نے وہیں سے ارسال کیا ہے)

یہ خانہ کعبہ ہے۔

یہ اللہ کا گھر ہے۔

دنیا کی حسین ترین شے جس پر ایک بار نظر جا پڑے تو پھر ہٹنے پر تیار نہیں ہوتی، کبھی اسے دیکھنے سے سیری نہیں ہوتی، نظر کبھی اسے دیکھنے سے تھکتی نہیں، کبھی دیکھنے والے کی آنکھ پلک جھپکنے پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوتی۔ اس پر سے آپ نظر کو ہٹانا بھی چاہیں تو وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ مزاحمت کرتی ہے، اسے دیکھنے کے بعد اگر آپ اپنی نظر ہٹانے میں کامیاب ہو جائیں تو، اگر وہ حسین و محبوب شے سامنے ہو، تو نظر ضبطِ نفس اور قوتِ ارادی کی تمام مزاحمتیں توڑ کر پھر اُسی مرکزِ نگاہ پر پہنچ کر شادکام ہوتی ہے۔ جس طرح شہد کی مکھی رس چوستے ہوئے پھول کا دامن نہیں چھوڑتی، جس طرح بُلبُل کھلے ہوئے پھول کی رفاقت چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتی، جس طرح چکور چودھویں کے چاند کی طرف دیوانہ وار لپکتا ہے اور اسے اپنی آغوش میں لے لینے کے لیے بے تاب ہوتا ہے، بالکل یہی کیفیت انسان کی نظر کی بھی ہو جاتی ہے۔ اس میں عجیب وارفتگی اور جنونِ عشق کی سی کیفیت نمودار ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے اپنے مرکزِ نگاہ سے ہٹنا پیاسے کا چشمے سے ہٹنے کے برابر ہوتا ہے۔

وہ مرکزِ نگاہ بیت اللہ شریف ہے۔

وہ چوکور گھر جو سیاہ غلاف میں لپٹا ہوا حرم کے وسط میں صدیوں سے خاموش کھڑا ہے، چپ چاپ، پُرجلال، پُرعظمت، پُرہیبت، پُرکشش، پُربہار، پُررونق اور پُرمحبت و شفقت ـــ لیکن ـــ وہ خاموش کہاں ہے؟ اس کے نور رونگٹے رونگٹے سے عظمت و ہیبت کا ہمالہ سر اُٹھائے کھڑا ہے اور اس کے غلاف کا

تار تار کشش و رونق اور محبت و شفقت کے ساتھ ہر ہر متنفس کو اپنی آغوشِ رحمت کی دلنواز گرفت میں لے کر دنیا و ما فیہا کے غم و آلام سے بے خبر و بے نیاز کیے دیتا ہے ۔ وہ خاموش نہیں ہے، وہ ہر دل کی دھڑکن ہے ۔ ہر نظر جو اس کی طرف اٹھتی ہے وہ یہی پکارتی ہوئی سنائی دیتی ہے کہ ؎

ترا ہی شوق مری زندگی کا سرمایہ
تجھے ہی دیکھتے رہنا نماز ہے میری

عظمت و ہیبت اس چوکور سیاہ ملفوف گھر کی تاحدِ نظر پھیلی ہوئی چادر ہے، کسی عظیم شہنشاہ کے دامنِ دراز کی طرح، اس گھر کو دیکھیں تو جہاں تسکینِ قلب و نظر ہے وہاں ہیبتِ صدر و جگر بھی ہے ۔ آدمی کا دل اپنی جگہ ڈولتا ہے، کانپتا ہے، تھرتھراتا ہے، کسی کے حضور میں حاضری کے احساس سے آدمی کا زہرہ آب آب ہوتا ہے، جیسے اسے اندر باہر سے، قرب و دور سے، دائیں بائیں سے، آگے پیچھے سے، اوپر نیچے سے، ہر طرف ہر سمت اور ہر جہت سے دیکھا جا رہا ہے، اس کا کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہے، نہ نیت نہ ارادہ، نہ خیالات اور نہ حرکات سبھی کچھ اس علیم و بصیر ہستی کی نگاہ میں ہے ۔ اس کی کوئی شے بھی اس ہستی سے پوشیدہ نہیں ہے ۔ اسے یوں دیکھا جا رہا ہے جیسے شیشے کے شفاف گلاس کو اندر باہر سے دیکھا جاتا ہے ۔ وہ اپنی کوئی کمزوری چھپا نہیں سکتا، وہ اپنا کوئی عیب ڈھانپ نہیں سکتا، اس کی بے شمار لغزشیں، کمزوریاں، خطائیں اور قلب و نظر کی چوریاں، اس کے آس پاس بیٹھنے والوں سے تو پوشیدہ ہیں، لیکن اس کے جسم کا ہر بُنِ مُو لاؤڈ اسپیکر بنا ہوا پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ کمزوری اور لغزش یہاں ہے اور یہ عادی مجرم حاضر ہے، یہ مجرم اپنے سارے گناہوں اور خطاؤں کو برسرِ عام لیے حاضر ہے ۔ آدمی اپنے رونگٹوں کی اس آواز کو اپنے دل کے کانوں سے صاف صاف سنتا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا ۔ نادم، شرمندہ، اندر ہی اندر گھٹتا ہوا، صاف صاف دیکھنے والے کے سامنے اپنے عیب و ہنر عریاں کیے ہوئے وہ یوں پھرتا ہے جیسے بچہ اپنی ماں کے آس پاس پھرتا ہے اور اسے اپنی ماں کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوتا اور ماں سے بھی وہ شفقت و محبت کی ہی امید رکھتا ہے ۔

عظمت و جلال اس گھر کا لباس ہے، عظمت و جلال اس ماحول کا خلعت ہے، عظمت و ہیبت اس چوکور سیاہ گھر کا جلیل القدر دامن ہے، آدمی اسے دیکھتا رہتا ہے اور اس کی عظمت کے نیچے دبتا

چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ پھر اسے اس عمارت کے سوا اس ساری فضائے بسیط میں اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ پاتال سے آسمان تک وہ ایک ہی گھر کھڑا ہوا اسے دکھائی دیتا ہے، شمال سے جنوب تک اور مغرب سے مشرق تک وہ ایک ہی عمارت چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ گھر سب سے بڑا، سب سے اُونچا، سب سے وسیع، اور سب پہ محیط دکھائی دیتا ہے، اور انسان یوں محسوس کرنے لگتا ہے کہ دُنیا میں اس پُرعظمت گھر کے سوا اور کچھ نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ہے، اپنا وجود تو اس گھر کی عظمت کے سامنے ذرۂ بے مقدار سے بھی حقیر دکھائی دیتا ہے، وہ ذرہ جو آفتاب کی روشن کرن کی ہم آغوشی سے مسرور ہو کر صحرائے بسیط کی وسعت میں اسی کی طرف رُخ کر کے یکایک چمک اُٹھتا ہے۔

اس گھر کے قربان جایئے، جیسے ذرہ آفتاب پہ قربان ہوتا ہے۔ اِس گھر کے عشق میں رقص کیجیے، جیسے پروانہ شمع کے گرد رقص کرتا ہے۔ اس گھر پہ نچھاور ہو جایئے جیسے کرنیں سورج پہ نچھاور ہوتی ہیں۔ اس کے گرد جھوم جھوم کر طواف کیجیے اور لہک لہک کر کہیے کہ:

اے میرے مالک! غلام حاضر ہے، غلام حاضر ہے۔

میرے عشق میں تیرا کوئی شریک نہیں۔

ساری تعریفیں تیرے لیے، ساری نعمتیں تیری طرف سے۔

ساری مملکت کا تو شہنشاہ ہے۔

تیرا غلام حاضر ہے، تیرا بندہ حاضر ہے۔

یہ نغمۂ جانفزا نغمۂ بندگی ہے، نغمۂ بہار ہے، نغمۂ وارفتگی وجنون ہے، نغمۂ عشق و دیوانگی ہے۔ نہیں، یہ نغمۂ مقصدِ زندگی ہے، اسی میں سب کچھ موجود ہے، اسی میں ساری کائناتِ آرزو پوشیدہ ہے۔

ہر بار اس گھر کے گرد چکر لگایئے، اس پہ نچھاور ہو جایئے، اس کے تپتے فرش پہ، اس کے نرم و گداز فرش پہ، ہو سکے تو سر کے بل چلیے۔ یہ مالک کا صحن چمن ہے۔ یہ مالک کا گھر ہے۔ اس لیے یہ ہمارا حقیقی گھر ہے۔ ہر بار دیوانہ وار چکر لگایئے، سفید کفن پہنے ہوئے جو انسان کا اوّل و آخری لباس ہے۔ کپڑے کا بے سلا ٹکڑا نیچے اور اوپر اوڑھے ہوئے، لپیٹے ہوئے، دوسرے دیوانوں کے ساتھ مل کر گردش کیجیے جیسے ستارے چاند کے گرد گردش کرتے ہیں۔ ہر گردش میں رکنِ یمانی کو محبت و عظمت سے چھویئے۔ ہر گردش میں

جنت کے پتھر حجرِ اسود کو بوسہ دیجیے، اور بے جھجک بوسہ دیجیے، اس پر صالحین نے بوسے دیے ہیں، اس پر اولیاء نے بوسے دیے ہیں، اس پر خدا کے برگزیدہ بندوں نے بوسے دیے ہیں، اس پر صحابہ کرام نے بوسے دیے ہیں، اس پر انبیاء کرام نے بوسے دیے ہیں اور اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بوسے دیے ہیں۔ دیکھیے یہ کیسا مرکزِ کیف و سرور ہے۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ لبوں کے لمس کا کتنا لطیف واسطہ ہے، اسے بوسے دیجیے اور گردش کیجیے، گردش کیجیے اور بوسے دیجیے، یہ بوسہ گاہِ مومنین ہے، یہ لطف و کرم کی بارش کا مقام ہے۔

گردش کرتے جائیے اور گردش کیجیے، بار بار، دیوانہ وار، فقیرانہ اور درویشانہ، مجنونانہ، دنیا و مافیہا سے بے نیازانہ۔ بس یہ سمجھ کر کہ بندہ ہے جو نچھاور ہو رہا ہے۔ مالک ہے جو بندے کی بے تابیوں کو نگاہِ کرم سے دیکھ رہا ہے۔ بندہ مالک کی نگاہ میں ہے، اس کی ایک ایک حرکت، اس کی ایک ایک جنبش، اس کا ایک ایک قدم جو بے تابی سے اُٹھتا ہے، اس کی ایک ایک دُعا جو بے تاب لبوں سے اضطراب کا لباس پہن کر نکلتی ہے، سب کچھ دیکھا جا رہا ہے۔ اس لیے گردش کیے جائیے، دُعائیں کرتے جائیے، دل کی کوئی حسرت باقی نہ رہے، نچھاور کرنے کے لیے کوئی آرزو باقی نہ رہے، مزید گردش کیجیے یوں کہ جیسے ساری کائنات آپ کے ساتھ گردش کر رہی ہے، اور یوں اس گردش میں گم ہو جائیے کہ جیسے اب کائنات میں دو ہی ہستیاں موجود ہیں، من و تو کے حجابات سب اُٹھ گئے ہیں۔ شمعِ کعبہ ہے اور اس کا ایک وارفتہ پروانہ ہے۔

اور اب آپ کے سات چکر پورے ہو گئے ہیں، آپ نچھاور ہو چکے، پروانہ اندازِ جنوں دکھا چکا، اب مالک کی چوکھٹ (ملتزم) سے لپٹ جائیے، آپ لپٹ گئے، اب کوئی آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہے، آپ تو بے اختیار سسک سسک کر رو رہے ہیں جیسے مہربان مالک کا دامن یکایک ہاتھ میں آگیا ہے، جیسے بھولا ہوا، بھٹکا ہوا، کھویا ہوا بچہ رات گئے گھر میں واپس لوٹ آیا ہے اور اب ماں کی آغوش سے لپٹ لپٹ کر رو رہا ہے۔ یہاں کوئی شخص بھی اپنے رونے پر قابو نہیں رکھ سکتا، سسکیاں، ہچکیاں بن جاتی ہیں، ہچکیاں ہلکی ہلکی چیخوں میں تبدیل ہونے لگتی ہیں اور آنسو آنکھوں سے اس طرح بہہ نکلتے ہیں جیسے اسی دن کے لیے ہی ان آنسوؤں کو پیدا کیا گیا تھا، اب مالک کی چوکھٹ ہے اور بندے کا سر ہے، بندے کی خطائیں اور آرزوئیں ہیں اور آنسوؤں کی

زبان ہے، اور یہ زبان حقیقت ترجمان ہے، آنسوؤں کی زبان کبھی جھوٹ نہیں بولتی، ہمیشہ سچ بولتی ہے۔ اور دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے، وہ اگرچہ پر پرواز نہیں رکھتی، لیکن طاقتِ پرواز ضرور رکھتی ہے، اور یہاں تو براہ راست وہ چوکھٹ پہ ہے، اسے پرواز کی حاجت ہی کیا ہے۔

یوں میں چوکھٹ سے لپٹا ہوا رو رہا تھا جب میرے کان میں آواز پڑی:

"مینڈھے سائیں۔ السلام علیکم"

اللہ اکبر! میں ابھی باہر کھڑا دروازے پہ ہلکی ہلکی دستک ہی دے رہا تھا، اور یہ سندھ سے آیا ہوا میرا بھائی سیدھا صحنِ مکان میں پہنچ کر براہ راست صاحب البیت سے علیک سلیک کر رہا تھا، جیسے اس کے اور صاحب البیت کے درمیان اب کوئی پردہ حائل نہ رہا تھا، اور وہ اس سے براہ راست خود بات کر رہا تھا۔ بس میری تو چیخ ہی نکل گئی، جیسے میرا سارا سفر ادھورا رہ گیا تھا، اور میرے سامنے ملتزم سے چمٹا ہوا کھڑا میرا بھائی اپنا سفر مکمل کر کے صحن میں داخل ہو گیا تھا، اب وہ مسلسل سرگوشیاں کر رہا تھا، اس کی سرگوشیوں نے میرے جذبہ بندگی میں بھی بے پناہ اضافہ کر دیا۔ اور میں بھی قربتِ حبیب میں بہت دُور تک آگے نکل گیا۔

یوں کبھی کبھی جذبہ رشکِ بندگی بھی انسان کو مہمیز کا کام دیتا ہے اور وہ بندگی کے مدارج طے کرنے میں سرعت و توانائی کا باعث ہوتا ہے۔

یہاں پہنچ کر حقیقتِ سجدہ کھلتی ہے۔ سمتوں اور جہتوں کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے، سمتوں اور جہتوں کی پابندی ختم ہو جاتی ہے۔ آدمی شعور سنبھالتے ہی اپنے آپ کو ایک خاص سمت میں سجدہ کرتے ہوئے پاتا ہے، اور وہ اُس کی سمت قبلہ ہے۔ اسی طرف اس کی مسجد کا رُخ ہے، اسی سمت اس کی مسجد کا محراب ہے، اس کے مصلّے اسی رُخ بچھتے ہیں۔ اور وہ اور اس کے اہلِ وطن سب اسی جہت میں سجدہ کرتے ہیں، اس طرف وہ پاؤں پھیلا کر نہیں لیٹتا، اس سمت کا خاص ادب ہمیشہ ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ وہ سمت مقدس ہو جاتی ہے۔ یہ عمل نسل درنسل کرتے کرتے بالآخر وہ اسی سمت کا پابند ہو جاتا ہے اور وہ غیر شعوری طور پر اسی سمت کو قبلہ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ سمت اور قبلہ دونوں لازم و ملزوم ہیں، دونوں یکساں احترام و اکرام کے مستحق ہیں اور پھر جب وہ اپنے مالک کے گھر پہنچتا ہے، تو یہاں پہنچ کر اچانک وہ طلسمِ سمت و جہت ٹوٹ جاتا ہے، صبح کی نماز میں بیت اللہ کے مشرقی جانب کھڑا ہو کر وہ مغرب کی طرف سجدہ کرتا ہے، تو ظہر کو مغربی جانب کھڑا ہو کر

مشرق کی طرف سجدہ کرتا ہے، عصر کے وقت بیت اللہ کے شمالی جانب کھڑا ہو کر جنوب کی طرف سجدہ کرتا ہے تو مغرب میں جنوب کی طرف کھڑا ہو کر شمال کی طرف سجدہ کرتا ہے، اور ہر طواف میں کبھی شمال، کبھی جنوب، کبھی مشرق اور کبھی مغرب کی طرف رُخ کرتا ہے۔ سمتوں اور جہتوں کا طلسم زمان و مکان ٹوٹ جاتا ہے اور قلب کی پوری گہرائی کے ساتھ اس کے اندر یہ حقیقت پیوست اور جاگزیں ہو جاتی ہے کہ سمتوں اور جہتوں کا مالک وہ ایک ہی ہے اور سجدہ صرف اسی کے لیے روا ہے اور صرف اسی کے لیے مخصوص ہے۔ یہ سمتیں تو ڈھلتے، چڑھتے اُترتے اور پھیلتے ہوئے سائے ہیں اور سایوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ حقیقتِ عظمیٰ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ سجدہ صرف مالک کے لیے ہے جو تمام سمتوں، جہتوں اور زاویوں کا پیدا کرنے والا ہے۔

سجدوں اور سمتوں کی حقیقت سے آشنا ہو کر انسان پیچھے پلٹ کر زمزم کے ابدی چشمے کی طرف آتا ہے جہاں تشنگانِ محبت کا ہجوم رہتا ہے، یہ کتنا عظیم چشمہ ہے جو صدیوں سے مسلسل بہہ رہا ہے، یہ اس سنگلاخ زمین کے سینے میں ٹھاٹھیں مارنے والا سمندر ہے، جس کی لہریں اُبھر اُبھر کر آہنی نالیوں کے ذریعے تشنہ لب انسانوں میں ان گنت صدیوں سے تقسیم ہو رہی ہیں، یہ ساری دنیا کو سیراب کرنے والا واحد چشمہ ہے جس کا پانی زمین کے گوشے گوشے اور کونے کونے میں پہنچتا ہے۔ اور لوگ اسے متبرک آبِ شفا سمجھ کر پیتے اور اپنی نزع کے خشک لبوں کے لیے محفوظ رکھتے ہیں۔

ذرا سُننا، یہ ایک طرف سے ننھے سے بچے کے رونے کی آواز آئی ہے، جس کی ماں اس کے لیے پانی لینے زمزم کی طرف چلی جا رہی ہے۔ ننھے بچے کے اس رونے کی آواز نے زمانے کی دبیز تہوں میں سے بی بی ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کی یہاں پہلی آمد کا منظر اُبھار کر آنکھوں کے سامنے پھیلا دیا ہے۔

دُور دُور تک ہر طرف لق و دق صحرا پھیلا ہوا ہے، کوئی آدم ہے نہ آدم زاد ہے، کھجوریں اور پانی کی چھوٹی سی ایک چھاگل ہے جو خلیل اللہ اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے دُودھ پیتے بچے اسمٰعیلؑ کو دے کر گئے تھے، لیکن وہ کھجوریں اور چھاگل تو اس وادیٔ غیر ذی زرع میں چند دنوں میں ہی ختم ہو چکے ہیں، چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان دُور دُور تک پھیلا ہوا سطح مرتفع پر نیم صحرائی زمین کا یہ سینہ ہر قسم کی زندگی اور روئیدگی سے خالی پڑا ہے اور اب معصوم بچہ پیاس سے تڑپ رہا ہے، اس صحرائی جنگل میں اب کون ہے جو اس کی مدد کو پہنچے؟ ابراہیمؑ کئی دن پہلے اپنے رب کے حکم کے تحت انہیں یہاں چھوڑ کر جا چکے۔ یہاں پانی کے

کوئی آثار نہیں۔ یہاں جنگلی درخت بھی نہیں ہیں، خشک اور چٹیل ریت اور ٹیلے اور پہاڑیاں ـــ اور ان کے درمیان وہ ماں بیٹا مجبور و بے کس، بے یار و مددگار اور بھوکے پیاسے۔ ماں اپنی جان پر سب دکھ سہہ سکتی ہے لیکن معصوم بچے کو تڑپتا ہوا کیسے دیکھے!

وہ مضطرب ہو ہو کر دوڑتی ہے، پہاڑی کے ٹیلے کی طرف، شاید دُور کہیں کوئی آدم زاد نظر پڑ سے، یا پانی دکھائی دے لیکن دُور دُور تک سوائے بل کھاتے ہوئے سرابوں کے کچھ بھی تو نہیں ہے۔ ماں کو صحرا کی اس خشک حقیقت کا علم ہے، لیکن علم کا اضطراب سے کیا واسطہ ہے؟ اس کا بچہ پیاسا ہے اور وہ رو رو کر ہلکان ہو رہا ہے اور ایڑیاں مار مار کر اپنی پیاس کا اعلان کر رہا ہے۔ بے تاب ماں، بے بس اور لاچار ماں، دوڑتی ہوئی ایک ٹیلے تک جاتی ہے، دُور دُور تک نظر دوڑاتی ہے، کہیں کچھ نہیں پاتی، سوائے اپنے بچے کی دردناک فریادی آواز کے، وہ دوڑتی ہوئی واپس آتی ہے، پھر بچے کو بخیریت دیکھ کر دوسری پہاڑی پر چڑھ جاتی ہے، پورے سات بار اِدھر سے اُدھر وہ دوڑتی ہے، اور جب آخری بار وہ اپنے پیارے بچے کی طرف آتی ہے تو بچے کی ایڑیوں کی رگڑ نے ان گنت صدیوں کے خشک اور چٹیل صحرا کے سینے میں سے پانی کا چشمہ بہا دیا ہے۔ ننھے سے بچے کی ننھی ننھی ایڑیوں کی رگڑ میں یہ صحرا گداز توانائی کہاں سے آگئی؟ یہ اس دھرتی کے مالک نے خاص اسمٰعیلؑ کی فریاد پر ترس کھا کر، خاص اس کی ماں کے اضطراب پر رحم کھا کر، خاص اپنی قدرتِ کاملہ کے ذریعے، ننھے بچے کی پیاس بجھانے کے لیے اسے یہ تحفہ چشمہ عطا فرمایا ہے۔

لے، اے پیاسی انسانیت! اسمٰعیلؑ کے چشمے سے سیراب ہو کر پانی پی۔ اس پانی میں بچے کی ضرورت کے مطابق دودھ کی سی خاصیت ہے، یہ دُودھ کی طرح انسان کو غذا بھی دیتا ہے اور اس کی پیاس بھی بجھاتا ہے۔ زمین کے سینے پر لاکھوں چشمے ہیں، ان سب چشموں سے دھرتی کا سینہ اپنا پانی بہاتا ہے، لیکن زمزم کے چشمے کا پانی نرالا ہی ہے، یہ صرف پانی کا چشمہ نہیں ہے، یہ ننھے اسمٰعیلؑ کی ضرورت پوری کرنے کے لیے قیامت تک کے لیے قدرت نے عطیہ الٰہی کے طور پر رواں کر دیا ہے، اس کی خنکی پیاس کو بجھاتی ہے، اس کی غذائیت بھوک مٹاتی ہے، اس کی افراط پیاسے انسان کو تسکین دیتی ہے، اور اس کی بہتات سے اس کے کنارے مکّہ کا شہر آباد ہو گیا ہے، مکّہ کی آبادی کا سب سے بڑا سبب یہی چشمۂ زمزم ہے، یہ نہ ہوتا تو یہاں مرکزِ انسانیت نہ ہوتا، نہ یہاں کعبہ تعمیر ہوتا، نہ یہاں ابراہیم خلیل اللہ اور اسمٰعیلؑ ذبیح اللہ جیسے معمارانِ حرم خانۂ کعبہ تعمیر کرتے، اور نہ کوئی قبیلۂ جرہم یہاں آکر آباد ہوتا، یہ چشمہ پیاسی انسانیت کی روحانی پیاس کو بجھانے کا سب سے

بڑا منبع ہے اور ہزاروں سالوں سے کروڑوں مخلوقات یہاں سے سیراب ہو رہی ہے اور قیامت تک ہوتی رہے گی۔

اور میں بھی حرم کے گرم گرم تپتے فرش پر جلد جلد پاؤں ٹکاتا ہوا جب اس چشمے کے گھر سے صحن میں داخل ہوا تو میری ساری تشنگی بجھ گئی، یہ افراط کا مقام ہے، یہاں کھُل کر زمزم پیجیے اور بے تکلف اس کو اسی طرح استعمال کیجیے جیسے ان گنت تشنگان لب ہمیشہ کرتے چلے آئے ہیں۔ خوب پیٹ بھر کر تشنگی بجھایئے، وضو تازہ کیجیے، زمزم میں اپنے آپ کو، اپنے پورے وجود کو یوں سیراب کر لیجیے جیسے بچہ ماں کے دودھ سے سیراب ہوتا ہے، یہ چشمۂ انسانیت ہے، یہ متاعِ انسانیت ہے، اس سے اجتناب اور بخل تنگ ظرفی ہے، یہ اسمٰعیلؑ کا کھُلا لنگر ہے۔

اب آپ تازہ دم ہیں تو ذرا ان پہاڑوں کی طرف چلیے جن کے درمیان تمام اہلِ ایمان کی ماں بی بی ہاجرہ بے تاب اور مضطرب ہو ہو کر دوڑتی رہی تھیں۔ ماں میں بڑی قوت ہوتی ہے، ماں میں بڑی قربانی ہوتی ہے۔ ماں میں بڑی توانائی اور بڑا ایثار و استقلال ہوتا ہے۔ ماں اشیاء کی حقیقت کو بدل ڈالتی ہے۔ الفاظ کے مفہوم اس کے آگے ہیچ ہو جاتے ہیں۔ بھائی میرے! صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان جن کا فاصلہ فرلانگ بھر ہے، تم سات چکر لگاتے ہوئے تھکے جا رہے ہو، جہاں دوڑنا پڑتا ہے، وہاں سانس پھولتا ہوا محسوس کرتے ہو، جہاں چڑھنا پڑتا ہے وہاں لغزشِ پا کا احساس کرتے ہو، نہیں جانتے ہو کہ یہ کس کی یادگار ہے؟ کس کے نقشِ پا پر تم قدم اُٹھا اُٹھا کر رکھ رہے ہو؟ یہ ایک عظیم ماں کے عظیم جذبۂ محبت و شفقت اور اضطرار و اضطراب کا چکر ہے، جسے تم سعی کہتے ہو، یہ میل بھر سے زائد سفر، یہ دوڑ، جو تم ٹھنڈے ٹھنڈے سایہ دار صاف ستھرے برآمدوں میں لگاتے ہو، یہ بے ساختہ دوڑ، دھوپ، ریت، گرمی، پتھروں، ٹیلوں، پیاس، اضطراب اور بے چینی کے درمیان لگائی گئی تھی۔ اور ایک عورت نے لگائی تھی، جسے کوئی سہارا سوائے خدا کے اور کوئی مدد سوائے اللہ کے، اور کوئی زادِ راہ سوائے بھوک پیاس کے حاصل نہ تھا۔

اور میں بھی صفا اور مروہ کے درمیان اپنے ساتھی عبدالسلام ابراہیم کے ساتھ دوڑ لگاتا رہا۔ پہلا چکر بڑے جوش و خروش سے لگا۔ یہ میری ماں کے نقشِ قدم پر چکر لگانے کا کام ہے۔ دوسرا چکر ختم ہوا۔ پھر تیسرا

اور جب چوتھا شروع ہوا تو وہ میرا دیرینہ سینے کا درد جاگ اُٹھا جس سے میں پہلے ہی ڈر رہا تھا۔ میرا ساتھی آہستہ آہستہ میرے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اور میں بھی آہستہ آہستہ دوڑ رہا تھا۔ تیز تیز چل رہا تھا۔ اور میرے سینے کا درد بھی سینے سے اُٹھ کر میرے بائیں بازو میں اور پھر پورے سینے میں دوڑ رہا تھا۔ میرے خدا۔ اس ظالم درد نے کس بے وقت مجھے آن پکڑا تھا ــ میں نے دل کی گہرائی سے دُعا کی ــ یا رب۔ میری لاج رکھیو۔ اپنے بندے کی دستگیری کیجیو۔ سعی کے دوران میں سرا ہے بیٹھنے یا اپنے ساتھی کے سامنے اپنی اس بیماری یا کمزوری کا اظہار کرنے پر تیار نہیں تھا۔ میں نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ لیا اور درد کو خوب دبا لیا۔ اور دوسری دُعاؤں کے درمیان سعی کو کامیابی کے ساتھ مکمل کرنے کی بھی دُعا کرنے لگا۔ یا رب یہ وقت تیری دست گیری کا ہے۔ اب مجھے بیماروں کی طرح بیٹھنے سے محفوظ رکھنا اور سعی کو بخیریت مکمل کرنے کی توفیق دینا ــ میں سعی کے درمیان بیٹھنے یا ٹھہر جانے پر بھی تیار نہ تھا اور پھر درد کی ٹیس سمندر کی پُرسکون لہر کی طرح اُٹھی اور ریتیلے ساحل سے ٹکرا کر خاموشی سے واپس جانے والی لہر کی مانند واپس چلی گئی اور پھر مکمل دب گئی۔

میرے سر اور کنپٹیوں پر پسینہ آ گیا۔ میں نے سینے پر ہاتھ زیادہ مضبوطی سے دبا لیا اور پھر درد مکمل غائب ہوگیا۔ صرف ہلکی سی کمزوری پیچھے چھوڑ گیا۔ اور میں خاموشی اور اطمینان سے ابراہیم سوڈانی کے ساتھ دوڑ لگاتا رہا۔ چوتھا، پانچواں اور چھٹا چکر اور جب ساتواں چکر شروع ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ اسلام کے سارے احکام انسان کی حدِ استطاعت کے مطابق ہیں۔ روزے تیس سے زائد ہوتے تو سخت تر ہوتے اور چکر بھی سات سے زائد ہوتے تو سخت تر ہوتے۔ لیکن اللہ کی راہ میں قدم اُٹھانا ہی تو ایک شرط ہے۔ پھر آگے بڑھ کر دست گیری تو مالک خود کرتا ہے اور آقا کی دست گیری کا تجربہ زندگی میں ہر بندے کو ہوتا ہے۔

یوں میں نے جب سعی مکمل کر کے مروہ کی اُونچی چوٹی پہ کھڑے ہوئے دیر تک دُعا کی جو میرے ساتھی ابراہیم کو قطعاً معلوم نہ تھا کہ میری دُعا کی طوالت میں میرے سانس کی درستی کا وقفہ بھی شامل تھا اور میں شاداں و فرحاں بال ترشوانے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ چونکہ میں نے سعی مکمل کر لی تھی اور یہ پُرمشقت کام جسے میری ماں ہاجرہ نے بھی اپنے بچے کی محبت میں اضطراب اور پریشانی میں کیا تھا ــ ختم ہوگیا۔

اور اب تم ذرا غور تو کرو اور سوچو کہ آج کی اس سعی اور اُس سعی میں کتنا فرق ہے۔ یہ سکون و اطمینان و تسکین و

سہولت کی سعی ہے وہ اضطراب و اضطرار، بھوک پیاس، اندیشے اور بچے کے خوفِ ہلاکت کی سعی تھی۔ اِس سعی اور اُس سعی میں معنوی لحاظ سے زمین و آسمان کا فرق ہے اور یہ اسی کی یادگار ہے۔ اس یادگار پر قربان جائیے جو ہماری ماں کی ہو، جو پوری انسانیت کی محترم ہستی کی ہو۔ اگر ہم سر کے بل بھی یہ سعی کریں تو اُس سعی کا عُشرِ عشیر بھی نہیں ہو سکتا جو انہوں نے کی تھی، اِسی لیے تو وہ مالک کو بہت پسند آئی تھی، وہ اضطراب بھی مالک کو پسند تھا، وہ پیاس بھی مالک کو پسند تھی، وہ دوڑ دھوپ بھی مالک کو پسند تھی، اور اتنی پسند آئی تھی کہ اسے قیامت تک کے لیے اپنے فرمانبردار بندوں کے لیے نشانِ بندگی قرار دے دیا گیا۔ اب جس کسی کو مالک کی خوشنودی مطلوب ہو وہ اپنی عظیم ماں کے نقشِ قدم پر چلتا ہوا ان ٹیلوں کے درمیان سعی کرے اور دوڑ لگائے، مالک اسے اپنی راہ میں دوڑتا ہوا دیکھ کر اس سے خوش ہوگا، صفا و مروہ کی یہ سعی مومنین کے نیک افعال میں ثبت کر دی گئی ہے اور ایک ماں کی بے تابی حج کے ارکان میں محفوظ کر دی گئی ہے۔

عمارتِ کعبہ کے ساتھ معمارِ کعبہ کا نقشِ قدم بھی اب تک محفوظ ہے، مکہ کے نسّاب کہتے تھے کہ اس نقشِ قدم سے جو عمارت کے پہلو میں مقامِ ابراہیم پر چلا آ رہا ہے، حضور اکرمؐ کا نقشِ قدم بہت ملتا جلتا تھا، دادا کا پاؤں پوتے کے پاؤں کی مانند اور پوتے کا پاؤں دادا کے پاؤں کی مانند تھا، دونوں کا ایک ہی ملّت سے تعلق تھا، ملّتِ ابراہیمی اور ملّتِ مسلمہ ایک ہی ملّت کے دو نام قرار پائے، دونوں کے اُسوؤں پر چلنا اسلام کی شان ہے، اور دونوں پر درود و سلام پڑھنا مسلمان کے لیے اعترافِ احسان قرار پاتا ہے۔

"مالک! تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آلِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ویسے ہی صلوٰۃ و برکت عطا فرما جیسے تو نے ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ کو عطا فرمائی۔"

دیکھیے کیسی مماثلت ہے، کیسی یک جہتی ہے! یہ قربانی و ایثار، تعمیر و ترقی اور مساواتِ انسانیت کا امین ہے، یہ کامل دین ہے، انہیں کے نقشِ قدم پر چل کر اب انسانیت فلاح پا سکتی ہے۔

اسوۂ ابراہیمیؑ اور اسوۂ محمدیؐ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جانفشانی مومن و مسلم کا نشان ہے۔ اللہ کے لیے گھر بار سے ہجرت اور دشت و صحرا کی بادیہ پیمائی سنتِ ابراہیمیؑ اور سنتِ محمدیؐ ہے، اللہ کی راہ میں باطل سے ٹکرا جانا، اہلِ خانہ، اہلِ محلہ، اہلِ بستی اور اہلِ قبیلہ تک سے نبرد آزما ہو جانا سنتِ ابراہیمیؑ اور سنتِ محمدیؐ ہے۔ غربت و فقر و درویشی اور صحرا نوردی سنتِ ابراہیمیؑ اور سنتِ محمدیؐ ہے، اللہ کے کلمے کو بستی بستی، قریہ قریہ، شہر شہر

بلند کیے پھرنا، اور دشمنانِ حق سے انتقامِ حق لینا بھی سنّت ابراہیمیؑ اور سنّت محمدیؐ ہے۔ بھوک پیاس سہنا، پیٹ پر پتھر باندھنا، اپنے اہلِ بیت کو راہ حق میں قربانی کے لیے پیش کر دینا یہ بھی سنّتِ ابراہیمیؑ اور سنّتِ محمدیؐ ہے، اور سنّتِ ذبحِ عظیم بھی دونوں میں مشترک ہے جیسے اقبالؒ نے یوں بیان کیا ہے ؎

نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

یہ حرم، پوری انسانیت کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔ یہ پاکیزہ انسانیت کا ایک دلنواز اور نظرافروز گلدستہ ہے، یہ اسلام کے پورے ارضی چمن کا نمائندہ صحن ہے، یہ ایمان افروز اجتماعِ نورانیت ہے، یہ دلگداز نغمۂ توحید ہے، یہ دلفریب مرقعِ وحدتِ انسانیت ہے، یہاں گلہائے رنگارنگ ہیں لیکن سب کی خوشبو ایک ہے۔ یہاں مختلف بولیاں بولتی ہوئی ٹولیاں ہیں لیکن سب کا مفہوم ایک ہے، یہاں بے شمار دل دھڑکتے ہیں لیکن سب دلوں کی آرزو ایک ہے۔ یہاں بے شمار قلب سینوں میں امنڈتے ہیں لیکن سب کی تمنا ایک ہے۔ یہاں بے شمار مضطرب آنکھیں ہیں لیکن سب کا محبوب و مقصود و منتہا ایک ہے۔ یہاں بے شمار آرزوؤں اور تمناؤں کا ہجوم ہے لیکن ان تمناؤں اور آرزوؤں کا مرکز و محور ایک ہے، یہاں بے شمار سجدے ہیں لیکن سب کا مسجود ایک ہے۔ یہاں ایک خدا ہے، ایک رسول ہے، اور پورے ہجوم کی منزل ایک ہے، ایسی وحدت دنیا میں کہیں نہیں پائی گئی، یہاں خدا کے آخری پیغام کی پکار پر پوری انسانیت کے نمائندہ لوگ امنڈ امنڈ کر پہنچ گئے ہیں، اور ان پروانوں کا شوق روز افزوں ہے، جس طرح چڑھتے ہوئے بادل کو روکا نہیں جاسکتا، نہ امنڈتے ہوئے سیلاب کو تھاما جاسکتا ہے، نہ بہتے ہوئے دریا کو لوٹایا جاسکتا ہے، نہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کو سمیٹا جاسکتا ہے، اسی طرح اپنے مالک کی محبت سے لبریز انسانوں کے اس ہجوم کو تھاما نہیں جاسکتا، یہ انسانیت کا خوبصورت اور نمائندہ اجتماع ہے۔ اس کی شان ہر اجتماع سے زیادہ نرالی اور انوکھی ہے، یہ منظم ہجوم جس طرح یہاں ایک خدا، ایک رسول اور ایک دین پر جمع ہے، اسی طرح آخرت میں بھی جمع ہوگا اور اس کی کثرت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شادمان ہوں گے۔

حرم کے کبوتر بھی عجیب شان کے پرندے ہیں، بادل کی طرح امنڈ کر ادھر سے اڑتے اور اُدھر جا بیٹھتے ہیں: دھوپ میں، چھاؤں میں، دن میں، رات میں، دوپہر اور شام میں اِدھر سے اُدھر، یہ معصوم پرندے امن و سلامتی

اور معصومیت و وارفتگی کا نشان بنے اُڑتے رہتے ہیں، مشرق سے مغرب کی طرف، شمال سے جنوب کی طرف اور صحنِ حرم کی کنکریلی ٹکڑیوں میں بیٹھے ہوئے، اتنے بڑے ہجوم کے اندر نہ یہ گھبراتے ہیں اور نہ گندگی پیدا کرتے ہیں، صحنِ حرم صاف ستھرا رہتا ہے اور یہ ہزاروں پرندے شور و غل مچائے بغیر خاموشی سے اِدھر سے اُدھر اُڑتے رہتے ہیں۔ حرم کا ادب ملحوظ رکھتے ہیں، معلوم ہوتا ہے جیسے پاک صاف اور باوضو رہتے ہیں۔ ان کی گندگی کا شائبہ تک کہیں حرم میں دکھائی نہیں دیتا، شاید ان کی حرم میں رہنے کی اجازت صفائی اور پاکیزگی سے ہی مشروط ہے، یہ پرندے زائرین کے درمیان اس طرح بے تکلف اور بے دھڑک اڑتے پھرتے رہتے ہیں جیسے انہیں حفاظت کی ضمانت حاصل ہے، اور اس کا انہیں بھی علم ہے۔

حرم کا رمضان بھی عجیب کیف آور چیز ہے، لوگ دُور دراز سے عمرے کے لیے آتے ہیں، سفید چادریں اوڑھے طواف کرتے، عمرہ کرتے اور چند دن قیامِ حرم کرتے ہیں، ہر طرف لوگ حرم کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے رہتے ہیں، سب کا کعبہ، سب کے سامنے ہوتا ہے، مرکز میں کعبۂ آرزو ہے، اور اس کے اردگرد دُور دُور تک ہجوم مشتاقاں بیٹھا رہتا ہے۔ افطار کا وقت قریب آرہا ہے اور حرم کے چاروں طرف صحن میں جو بڑے بڑے گول گول ٹکڑوں کی شکل میں بٹا ہوا ہے زائرینِ حرم بیٹھے ہوئے ہیں، عصر کے بعد سرِشام سے ہی سارے صحنِ حرم میں کعبہ کے چاروں طرف صدیاں، چادریں، جانمازیں بچھنی چلی جاتی ہیں، ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں، ان کے درمیانی فاصلوں میں صراحیاں اور ان کی گھڑونچیاں رکھ دی جاتی ہیں، یہ صراحیاں زمزم کے پانی سے بھری ہوتی ہیں جو خدامِ حرم بھرتے ہیں۔ یہ صراحیاں ایسی مٹی سے بنی ہوتی ہیں کہ تھوڑی سی ہوا لگنے سے ہی ان کا پانی خوب ٹھنڈا ہو جاتا ہے، اور صحنِ حرم میں ہر وقت نہایت خوشگوار ہوا چلتی رہتی ہے، روزے کے افطار کے وقت تک یہ صراحیاں نہایت فرحت بخش اور گوارا حد تک ٹھنڈی ہو جاتی ہیں، پھر مغرب کا وقت قریب آتے آتے لوگ حرم کے اس کھلے گول دائرہ نما صحن میں آنے لگتے اور اپنی اپنی مقررہ جگہوں پہ بیٹھنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ مکہ کی آبادی کا شاید کوئی فرد بھی اپنے گھر میں نہیں رہ گیا ہے، ہر شخص روزہ افطار کرنے کے لیے صحنِ حرم میں پہنچ گیا ہے، سب کے سامنے کھجوریں، شربت اور دوسرا سامانِ افطاری موجود ہوتا ہے۔ کسی طرف پاکستان کے لوگ بیٹھے ہیں، ان کے ساتھ ہی سوڈان والے ہیں، ایک طرف مصریوں کی ایک ٹکڑی ہے تو دوسری طرف برما اور انڈونیشیا کے لوگ ہیں، کہیں افریقہ کے قوی ہیکل لوگ، کہیں ہندوستان کے

نحیف و نزار مسلمان، کہیں کابل، کہیں ایران، کہیں سندھ، کہیں بلوچستان، غرض پورا صحنِ حرم گلدستۂ انسانیت بنا ہوا ہوتا ہے۔ اور سب کے کان مؤذنِ حرم کی آواز پر ہوتے ہیں، یہاں تک کہ وہ نغمۂ جانفزا ہوا میں بلند ہوتا ہے جس سے بہتر، بڑا اور حقیقت پر مبنی اور کوئی کلمہ نہیں ہے۔

اَللّٰہُ اَکْبَر - اَللّٰہُ اَکْبَر!

اور اس کے ساتھ ہی دن بھر کی پابندی کے بند ٹوٹ جاتے ہیں اور روزہ خیر و عافیت کے ساتھ تکمیل پا جاتا ہے، ہر روزہ دار خدا کے گھر کے سامنے بیٹھ کر گواہی دیتا ہے کہ وہ اس کے حکم کا بندہ ہے اس کے حکم کا پابند ہے، صحنِ حرم میں لاکھوں کا مجمع موجود ہے، بچے، بوڑھے، عورتیں، مرد، اجنبی، مقامی سب موجود ہیں، لیکن مجال نہیں کہ کوئی آواز اس کے وقار کو مجروح کرے۔ ایک عدالت کا سا احترام موجود ہے، کوئی تصوّر نہیں کر سکتا کہ اتنے بڑے لاکھوں کے مجمعے میں سے کوئی آواز بلند نہیں ہوتی، کوئی بچہ نہیں روتا، کوئی عورت نہیں چیختی، کوئی مرد نہیں ڈانٹتا اور کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے نہیں الجھتا۔ یہ وقار، یہ سکون، یہ طمانیت، یہ احترام حیران کن ہے، یہ صحنِ حرم ہے۔

افطار کا وقفہ ختم ہوتے ہی پورے صحنِ حرم میں انسانوں کا منظم ہجوم قطار در قطار، صف بصف کھڑا ہو جاتا ہے۔ تکبیر بلند ہوتی ہے اور حرم میں کلیاں سی کھل جاتی ہیں۔ آمنے سامنے صفیں ہیں، درمیان میں بیت اللہ سیاہ غلاف میں ملفوف کھڑا ہے، ساری صفیں گول گول ہیں، ہر نمازی کا رُخ حرم کی طرف ہے اس طرح صفوں نے پھولوں کی پنکھڑیوں کی صورت اختیار کر لی ہے، اب کوئی شخص بھی کسی سمت کا پابند نہیں ہے، کسی امام کے رُخ کا پابند نہیں ہے، امام کا رُخ مغرب میں ہے تو مقتدیوں کا رُخ شمال، جنوب، مشرق، مغرب سب طرف ہے۔ چاروں طرف سے سجدوں کا رُخ حرم کی طرف ہے، عجیب کیف آور منظر ہے کہ آمنے سامنے سجدے ہو رہے ہیں، دائیں بائیں سجدے ہو رہے ہیں، شمال جنوب میں سجدے ہو رہے ہیں، اور سب کا رُخ کعبے کی طرف ہے۔ وہی سب کا محور ہے، وہی سب کا مرکز ہے، وہی سب کے دلوں کی دھڑکن ہے۔ وہی سب کی تمناؤں کا کعبہ اور آرزوؤں کا قبلہ ہے۔ وہی ہر ایک کے لیے سب کچھ ہے۔

حرم میں آفاقیت ہے، اس میں پوری انسانیت کا نچوڑ آ گیا ہے، اس میں ابن آدم کا صالح عنصر چھنٹ کر

پہنچ گیا ہے ، یوں باہر سے تو یہ ایک بڑا سا مکان ہے جس کی چار دیواری ہے اور جس چہار دیواری کے باہر محلّے کے محلّے ہیں ، سڑکیں ہیں ، بازار ہیں ، آبادی ہے ، لوگ ہیں اور وہ اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہیں اور اس سارے ہجوم کے درمیان ایک عظیم عمارت کھڑی ہے ، لیکن جونہی کوئی اس عمارت کے دروازے پہ کھڑا ہو کر اس کے اندر جھانکتا ہے تو اچانک اس کے سامنے سیاہ پوش نہایت دیدہ زیب جوکور مکان کا کوئی حصّہ آجاتا ہے جس کے غلاف پہ نہایت خوبصورت حاشیہ ہے ، یہ سنہری حروف کا حاشیہ ہے جس سے اس کی خوبصورتی اور زیبائش میں بے انتہا اضافہ ہو گیا ہے ۔ یہ سیاہ غلاف پوش فلک بوس عمارت آدمی کو پکڑ لیتی ہے ، اس کی نظر اس پہ پڑتے ہی انسان وارفتہ و شیدا ہو جاتا ہے ۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ باہر کے ماحول سے نکل کر فوراً اندر چلا جائے ، اندر جا کر وہ گویا ایک دوسری دنیا میں پہنچ جاتا ہے ، جس میں پوری انسانیت سمٹی ہوئی بیٹھی ہے ، ایک دلنواز چشمۂ روحانیت جاری ہے ۔ ایک دلفریب فضا آدمی کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور جب آدمی اس کے اندر پہنچ جاتا ہے تو وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچ جاتا ہے

دوسرا عالم ، جس میں مکہ شہر ہی نہیں ، پوری انسانیت سانس لے رہی ہے ۔

یہاں پوری دنیا موجود ہے ، یہاں پورا دین موجود ہے ، یہاں دین و دنیا دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں ۔

یہ حرمِ کعبہ ہے ، اسے بس دیکھتے رہیے ، اس کا دیکھنا بھی عبادت ہے ، اسے نمازِ دید کہتے ہیں ۔

رسائل و مسائل

حضرت یونس ؑ کا مچھلی کے پیٹ میں رہنا

سوال: ایک عریضہ ارسال خدمت کیا تھا۔ تادمِ تحریر جواب سے محروم ہوں۔ آج تک جواب کے لیے چشم براہ ہوں۔ اشکال تھا تفہیم القرآن، سورہ الصافات کے حاشیہ ۸۱ پر کہ "اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مچھلی قیامت تک زندہ رہتی اور حضرت یونسؑ قیامت تک اس کے پیٹ میں زندہ رہتے۔ بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ قیامت تک اس مچھلی کا پیٹ ہی حضرت یونس علیہ السلام کی قبر بنا رہتا" میرے اعتراضات و اشکالات درج ذیل ہیں:

۱۔ زندہ مچھلی کے پیٹ میں زندہ یونس علیہ السلام کے رہنے پر کیا اعتراض ہے؟

۲۔ مُردہ یونس علیہ السلام کے لیے مچھلی کے پیٹ کا قبر بنے رہنا میرے نزدیک منشاء آیاتِ الٰہی نہیں ہے۔

۳۔ کیا قدرتِ خدا سے یہ نہیں ہو سکتا کہ زندہ یونس علیہ السلام زندہ مچھلی کے پیٹ میں رہیں؟

۴۔ اب اگر قدرتِ خدا سے بعید ہے تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ مُردہ یونس علیہ السلام اور مُردہ مچھلی گلنے سڑنے سے بھی محفوظ رہے اور دوسرے دریائی جانوروں سے بھی محفوظ رہے؟

۵۔ جبکہ یہ واقعہ ظہور پذیر ہی نہیں ہوا تو اس پر قیاسات کی کیا ضرورت ہے؟ اس کی وہی تفسیر صاف اور سیدھی کیوں نہ رہنے دی جائے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کو مچھلی کے پیٹ سے ان کی توبہ کے پیش نظر نہ نکال لیتے تو ہمیشہ مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہتے؟

جواب: (ڈاکٹر ملک غلام علی) سورۃ الصّٰفّٰت آیت ۱۴۴ کی جو تاویل تفہیم القرآن میں اختیار کی گئی ہے، عجیب بات ہے کہ آپ نے اُسے تو قیاسات پر مبنی قرار دیا ہے۔ لیکن آپ کے نزدیک جو تفسیر درست ہے اسے آپ نے صاف سیدھی اور قیاس سے مبرا سمجھا ہے۔ حالانکہ دونوں میں کسی نہ کسی حد تک ظن و قیاس کا دخل ہے اور مولانا مودودی نے جو مفہوم بیان کیا ہے وہ ایسا بھی نہیں ہے کہ پہلی مرتبہ انہوں ہی نے پیش کیا ہو، اور اس سے پہلے کسی نے یہ مطلب نہ لیا ہو۔ مولانا نے خود ہی ابن جریر کے حوالہ سے یہ تحریر کر دیا ہے کہ مشہور مفسر

قتادہ نے اس آیت کا مطلب یہی بیان کیا ہے کہ قیامت تک اس مچھلی کا پیٹ حضرت یونسؑ کی قبر بنا رہتا۔

قرآن مجید میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر حضرت یونسؑ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو وہ یوم قیامت تک مچھلی کے پیٹ ہی میں رہتے۔ یہ جملہ شرطیہ ہے جس میں شرط کی تکمیل نہ ہو تو جواب شرط اور جزا کا وقوع لازم نہیں آتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے گا کہ اگر حضرت یونسؑ اللہ کی پاکیزگی بیان نہ کرتے تو وہ صورتِ حال واقع ہوتی جو آگے بیان ہوئی ہے۔ لیکن سورۂ انبیاء میں اس امر کی صراحت اور یہاں بھی اشارہ موجود ہے کہ حضرت یونسؑ نے مچھلی کے پیٹ اور سمندر کی تاریکیوں میں پکارا کہ:

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ -

(نہیں ہے کوئی خدا مگر تو، پاک ہے تیری ذات، بے شک میں قصور وار ہوں۔)

اس لیے اسی تسبیح و انابت کے بعد اللہ نے حضرت یونسؑ کو اس تکلیف سے نجات بخشی اور مچھلی نے انہیں زندہ ہی اگل دیا۔ اس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ اس بحث کی چنداں ضرورت نہیں رہتی کہ اگر یہ شرط پوری نہ ہوتی اور حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ سے زندہ و سلامت نہ نکل آتے تو ان پر قیامت تک کیا کیفیت گزرتی۔ قرآن و حدیث میں بھی کوئی بات اس ضمن میں ارشاد نہیں فرمائی گئی۔ تاہم علما و مفسرین نے اس معاملے میں بالکل سکوت اختیار نہیں کیا اور اس مسئلے پر اظہار خیال کیا ہے کہ حضرت یونسؑ کے مچھلی کے پیٹ ہی میں رہنے کا مدعا کیا ہو سکتا ہے؟ اس معاملہ میں بالعموم تین اقوال مروی ہیں، ایک یہ کہ مچھلی اور حضرت یونسؑ دونوں پر موت وارد ہوتی اور حضرت یونسؑ حشر کے روز مچھلی کے پیٹ سے دوبارہ اُٹھائے جاتے، دوسرا یہ کہ مچھلی تو مر جاتی مگر حضرت یونسؑ اس کے پیٹ میں زندہ موجود رہتے۔ تیسرا یہ کہ حضرت یونسؑ اور مچھلی دونوں قیامت تک زندہ رہتے اور حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ ہی میں رہتے۔ پہلا قول حضرت قتادہ تابعی کا ہے جو تفسیر ابن جریر، کشاف وغیرہ میں منقول ہے اور جسے مولانا مودودی نے قابل ترجیح سمجھا ہے۔ یہ قول متعدد دوسرے مفسرین کے ہاں بھی مذکور ہے۔ چند اقوال درج ذیل ہیں:

۱۔ امام ابن جوزی (المتوفی ۵۹۶) اپنی تفسیر زاد المسیر میں فرماتے ہیں:

لصار بطن الحوت له قبراً الى يوم القيامه

(... مچھلی کا پیٹ قیامت تک کے لیے ان کی قبر بن جاتا)

۲۔ امام فخر الدین رازی (المتوفی ۶۰۶ ہجری) اپنی تفسیر (مفاتیح الغیب) میں فرماتے ہیں:-

للبث فی بطن ذلک الحوت وکان بطنہ قبراً لہ الی یوم البعث

(اگر حضرت یونسؑ تسبیح نہ کرتے تو اُس مچھلی کے پیٹ ہی میں رہتے اور اس کا پیٹ یوم حشر تک ان کی قبر بنا رہتا)۔

۳۔ علامہ علاؤ الدین الخازن (المتوفی ۷۲۵) اپنی تفسیر "لباب التاویل فی معانی التنزیل" میں اور امام ابو محمد البغوی (المتوفی ۵۱۶) اپنی تفسیر معالم التنزیل میں دونوں اس آیت کی شرح میں فرماتے ہیں:

لصار بطن الحوت قبراً لہ الیٰ یوم القیامہ

(مچھلی کا پیٹ قیامت تک کے لیے حضرت یونسؑ کی قبر بن جاتا)

۴۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی (المتوفی ۱۲۲۵) اپنی تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں:

یعنی لمات فی بطنہ وصار لہ قبراً

(یعنی اگر تسبیح نہ کرتے تو حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں فوت ہوتے اور وہ ان کی قبر بنتی)

۵۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اپنے تفسیری حواشی میں فرماتے ہیں:

"..... ورنہ قیامت تک اس کے پیٹ سے نکلنا ممکن نہ ہوتا اور مچھلی کی غذا بن جاتے۔"

۶۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اپنی تفسیر بیان القرآن میں فرماتے ہیں:

"مطلب یہ ہے کہ پیٹ سے نکلنا میسر نہ ہوتا بلکہ اس کی غذا بنا دیے جاتے۔ پس اس مطلب پر اس کا اور اس کے بطن کا قیامت تک باقی رہنا لازم نہیں آتا۔"

۷۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی تفسیر ماجدی میں فرماتے ہیں:

"یعنی انھیں مچھلی کے پیٹ سے نکلنا نصیب نہ ہوتا اور وہ اسی کی غذا بنا دیے جاتے۔ یہ مطلب نہیں کہ مچھلی کا پیٹ قیامت تک محفوظ و سالم رہتا۔"

اب یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو تشریح ان سب اقوال میں بیان ہوئی ہے اور یہ تقریباً وہی بات ہے جو مولانا مودودی نے لکھی ہے، اگر یہ تشریح و تفسیر صاف اور سیدھی نہیں ہے تو آپ کی اختیار کردہ تفسیر کیسے صاف، سیدھی اور قیاس سے خالی بن جاتی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ زندہ مچھلی کے پیٹ میں زندہ یونسؑ علیہ السلام کے رہنے پر کیا اعتراض ہے؟ کرنے کو اگر کوئی شخص چاہے تو اعتراض پیدا کر لینا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ مثلاً کہا جا سکتا ہے کہ حضرت یونسؑ کا تسبیح نہ پڑھنا (یا ان کا اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے جانا) اتنی بڑی غلطی تو نہ ہو سکتی تھی کہ وہ

قیامت تک تاریکیوں میں محبوس و محصور کر دیے جاتے اور مچھلی کا کیا قصور تھا کہ ایک زندہ انسان اس کے بطن میں رکھ کر اسے بھی تاقیامت زندہ رکھا جاتا؟ پھر اگر دونوں کو یوم بعث ہی تک زندہ رکھا جانا تو ان پر موت واقع ہوتی یا نہ ہوتی اور ہوتی تو کب اور بعث سے کتنی دیر پہلے وارد ہوتی؟ آپ چاہیں تو ایسے اعتراضات کا کوئی نہ کوئی جواب دے سکتے ہیں مگر آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ کی پسندیدہ تاویل بھی اعتراضات و قیاسات سے بری نہیں ہے۔

پھر آپ کہتے ہیں کہ کیا قدرتِ خدا یہ نہیں ہے کہ زندہ یونس علیہ السلام زندہ مچھلی کے پیٹ میں رہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قدرتِ خدا تو ہر شے اور ہر صورت پر حاوی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ آپ خود تو قدرتِ خدا کے حوالے سے ہر بات فرض کرتے چلے جائیں خواہ کتاب و سنت اس بارے میں ساکت ہوں اور دوسرا شخص اگر اس کے خلاف بات کہے اور وہ بھی قدرتِ خدا سے بعید نہ ہو تو آپ اسے قیاسات و مفروضات پر مبنی اور آن ہونی قرار دے دیں۔ اسی طرح آپ کا یہ اعتراض بھی کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وفات یافتہ یونس علیہ السلام اور مردہ مچھلی گلنے سڑنے اور دوسرے دریائی جانوروں سے محفوظ رہیں؟ اوّل تو مولانا مودودی نے جو تاویل حضرت قتادہ سے نقل کی ہے اس سے حضرت یونسؑ اور مچھلی کے جسدِ عنصری کا بعینہٖ محفوظ ہونا لازم نہیں آتا بلکہ اس کا مفہوم فقط یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت یونسؑ کی وفات مچھلی کے پیٹ میں ہوتی اور قیامت کے روز مچھلی کے اجزائے منتشرہ کو جمع کر کے اس میں سے حضرت یونسؑ کو زندہ اٹھایا جاتا۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سمندر کی تہ میں کسی یخ بستہ منطقے میں حضرت یونسؑ اور مچھلی کے اجساد کو محفوظ فرما دیتا اور ان کو ہر تغیّر اور ہر دست بُرد سے بچا لیتا۔ اگر انھیں زندہ رکھ کر ہر گزند سے مامون کیا جا سکتا ہے تو موت دینے کے بعد کیوں نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے اب تک جو خامہ فرسائی کی ہے محض اس لیے کی ہے کہ آپ جواب کی وصولی کے لیے سراپا انتظار بنے بیٹھے ہیں اور ایک عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ مسئلہ جوں کا توں آپ کے ذہن پر مستولی ہے، ورنہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا اور میرے وقت کا اس سے بہتر مصرف ممکن تھا۔ میرے اس جواب کا ایک مقصد آپ جیسے سائلین و معترضین کے یہ ذہن نشین کرانا بھی ہے کہ مولانا مودودی کا مسلک و مشرب یہ ہے کہ وہ کتاب و سنت کے منصوص ارشادات اور اہل سنت کے متفق علیہا و مجمع علیہ مسائل سے سرِمُو تجاوز و انحراف نہیں کرتے۔ جہاں تک غیر منصوص اور مختلف فیہ مسائل کا تعلق ہے اس میں بھی وہ تفرّد کی راہ اختیار کرنے کے بجائے

(باقی بر صفحہ ۴۸)

(بقیہ اشارات) نام روانہ کرے گی تو عدالت کے لیے ناگزیر ہوگا کہ وہ نکاح کو زائل اور کالعدم سمجھے اور اس وقت سے اُسے کالعدم قرار دے جس وقت نوٹس کی تحریر و ترسیل عورت کی طرف سے عمل میں لائی گئی ہے۔ اس چیز کا نام حقوقِ نسواں کی نگہبانی کرنا نہیں، بلکہ انہیں قانون کی وساطت سے آوارگی و آبرو باختگی کی راہ پر دھکیلنا ہے۔ ایوب خان صاحب نے اپنے مارشل لا کے دَور میں مسلمانوں کے عائلی قوانین کا حلیہ بگاڑنے میں جو کسر باقی رہنے دی تھی اُسے اب ہماری "عوامی حکومت" اور اس کی مقرر کردہ کمیٹی پورا کرنے کی سعی کر رہی ہے جس کا نتیجہ معاشرتی فساد و انحلال کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

رپورٹ کی دفعہ ۵۰ تا دفعہ ۵۵ میں جو سفارشات مرتب کی گئی ہیں ان سب کا مشترک مقصد و مفاد یہ ہے کہ کمیٹی نے سراسر غیر اسلامی و غیر عقلی بنیاد پر جس طرح یہ تجویز کیا ہے کہ طلاق دینے والے مرد کو اس امر کا مکلف بنایا جائے کہ وہ مطلقہ کو جہیز، خرچہ اور اپنی جائداد میں سے حصہ دے، اب کمیٹی چاہتی ہے کہ اس گناہ گار انسان کو چند در چند قانونی جکڑ بندیوں میں اس طرح کس دیا جائے کہ وہ جیتے جی اس شکنجے میں سے نکلنے کے قابل نہ رہے۔ چنانچہ سفارش کی گئی ہے کہ عائلی عدالتوں کو ایسے وسیع اختیارات دیے جائیں کہ جب مطلقہ عورت اپنے سابق خاوند کے خلاف واپسیٔ جہیز، خرچہ وغیرہ کا استغاثہ کرے تو عدالت فیصلے سے قبل مرد کے خلاف یہ حکم امتناعی جاری کر سکے کہ وہ اپنی جائداد کو فروخت یا کسی دوسری شکل میں کسی کے نام منتقل نہیں کرے گا۔ عدالت چاہے تو عارضی دادرسی کے طور پر مرد کی املاک کی قُرقی کا حکم بھی جاری کر سکتی ہے۔ مرد کو یہ حکم بھی دیا جا سکے گا کہ عورت کے نان و نفقہ کا استحقاق ثابت ہونے سے پہلے ہی ہر مہینے وہ عدالت میں ایک متعیّن رقم تا فیصلہ جمع کراتا رہے جو عورت کو بطور نفقہ ادا کی جائے گی۔ اگر مرد اس تاوان کی ادائیگی سے قاصر رہے تو مقدمے میں اس کا حقِ جواب دہی قطع کر دیا جائے گا اور اس کے خلاف یک طرفہ کارروائی عمل میں لائی جائے گی۔ مرد کے خلاف اس عجیب و غریب قانونی تعدی اور دھاندلی کا جواز پیدا کرنے کے لیے دفعہ ۵۵ میں ۱۹۵۹ء کے اس قانون کی مثال دی گئی ہے جو شہری کرایہ داروں کے تحفظ کے لیے مغربی پاکستان میں نافذ ہے۔ گویا کہ میاں بیوی کا رشتہ کرایہ داری اور مکانداری کے تعلق کے مشابہ ہے! سبحان اللہ و بحمدہٖ، کیا لاجواب تشبیہ تلاش کی ہے۔ اس قانون کے تحت جب مالک مکان اور کرایہ دار کے درمیان جھگڑا ہو جاتا ہے اور کرایہ دار کرایہ دینے یا مالک کرایہ لینے سے انکار کر دیتا ہے اور مالک کرایہ دار کی بے دخلی چاہتا ہے یا کرایے میں اضافہ کا مطالبہ

کرتا ہے تو رینٹ کنٹرولر کے ہاں ایک فریق دعویٰ دائر کر دیتا ہے۔ اس کے بعد عدالت کرایہ دار کو پابند کر دیتی ہے کہ آخری فیصلہ ہونے تک وہ ایک متعین رقم بطور کرایہ عدالت میں جمع کراتا رہے۔ یہی صورت اب نکاح و طلاق کا کرایہ کنٹرول کرنے کے لیے تجویز کی جا رہی ہے۔

ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ سفارشات کا یہ حصہ ظلم بالائے ظلم اور دوہری ناانصافی پر مبنی ہے۔ ایک ظلم تو یہی ہے کہ طلاق کے بعد مطلقہ کے لیے ایسے حقوق ایجاد کیے جا رہے ہیں جو شرعاً و اخلاقاً بالکل بے جواز ہیں، پھر ان اختراعی حقوق کی بازیابی کے لیے جو طریق کار تجویز کیا جا رہا ہے وہ بجائے خود بڑا غیر منصفانہ اور منتقمانہ ہے۔ طلاق میں ہمیشہ قصور مرد ہی کا نہیں ہوتا۔ عورت کا بھی ہوتا ہے۔ لیکن فرض کیا کہ مرد ہی خطا کار ہے، تب بھی خطا اور سزا میں کوئی مناسبت تو ہونی چاہیے۔ طلاق دینا اتنا بڑا جرم تو نہیں ہے کہ اس کے پایۂ ثبوت کو پہنچنے سے پہلے ہی مرد کو اپنی املاک میں ہر قسم کے تصرفات سے روک دیا جائے، اس کی قرقی کے وارنٹ جاری کر دیے جائیں یا اُسے مجبور کر دیا جائے کہ اس کے خلاف جب تک مقدمے کا آخری فیصلہ نہ ہو وہ ایک متعین مقدار میں "کرایۂ نکاح" عدالت میں جمع کراتا رہے جو اس کی "لینڈ لیڈی" کو ادا ہونا چاہیے۔ مگر کرایہ دار جب مکان سے بے دخل ہو جاتا ہے تو اس کے بعد فریقین میں سے کسی ایک کا دوسرے پر کوئی مالی حق قائم نہیں ہو سکتا جس کی وصولی کے لیے ایک فریق کے خلاف قرقی یا انتقالِ جائداد کے امتناع کا حکم صادر کیا جائے۔ پھر کیا طلاق ہی اتنا بڑا اور سنگین جرم ہے جو ان ساری سزاؤں کا مستلزم ہو؟ کیا قرونِ اولیٰ میں کسی طلاق دینے والے کے لیے ایسی فوجداری یا دیوانی تعزیرات تجویز کی گئی تھیں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردہ صحابی حضرت زیدؓ نے آنحضرتؐ کی قریبی عزیزہ حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی تھی، حالانکہ آنحضورؐ نے فرمایا تھا کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑو اور خدا سے ڈرو۔ کیا اللہ اور اس کے رسولؐ نے بھی یہ حکم دیا تھا کہ زینبؓ کو اپنی جائداد کا ½ حصہ دو یا جتنے سال نکاح پر گزرے ہیں، اتنے ماہ کا نفقہ ادا کرو؟ کیا حضرت زینبؓ نے اپنے جہیز یا نفقہ کی ادائیگی کا کوئی دعویٰ یا حضرت زیدؓ کی جائداد کی ضبطی یا قرقی کا کوئی استغاثہ بارگاہ نبویؐ میں دائر کیا تھا؟ کیا کسی مسلمان عورت کے حقوق صحابیات سے بڑھ کر ہو سکتے ہیں جن کی نشاندہی اور بازیابی کا دعویٰ آج کیا جا رہا ہے؟

اس کے بعد ہم رپورٹ کی دفعہ ۶۲ کو لیتے ہیں جس میں فریقین کے لیے عائلی عدالت سے رجوع کے بعد عدالت سے باہر مصالحت کی ایک صورت تجویز کی گئی ہے۔ وزارتِ قانون کے فراہم کردہ ترجمے کی نقل مطابق اصل درج ذیل ہے۔ اگرچہ ایسی بھونڈی عبارت کا نقل کرنا اور پڑھنا ذوقِ سلیم پر بار ہے:

"کمیٹی کا یہ خیال ہے کہ فریقین کے درمیان مفاہمت کرانے کے امکانات عدالت کے اندر کے مقابلے میں عدالت سے باہر زیادہ ہیں۔ اگر کوششیں اس علاقے کے جس سے وہ تعلق رکھتے ہوں، چند ایماندار، فارغ البال اور غیر جانب دار باعزت اشخاص کی طرف سے کی جائیں۔ ہر ایک ضلع میں ضلع جج کا ایسے اشخاص کی ایک فہرست تیار کرنا مشکل کام نہیں ہے۔ ان اشخاص کو جنہیں افسرانِ بہبود کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے، عائلی عدالت کی طرف سے حکم دیے جانے پر مصالحت کنندہ کے طور پر کام کرنے کے لیے تیار کرنا چاہیے بحسبہ کمیٹی کی سفارش ہے کہ:

شوہر اور زوجہ کے درمیان عدالت سے باہر مصالحت کے لیے عدالت ہائے عائلی ایکٹ میں احکام وضع کیے جائیں۔ عائلی عدالت فریقین کی طرف سے مشترکہ درخواست پر ان اشخاص میں سے کسی کو جس کا نام ضلع جج کی تیار کردہ افسرانِ بہبود کی فہرست میں موجود ہو، مصالحت کنندہ کے طور پر کام کرنے کے لیے نامزد کرے۔ بایں طور نامزد کردہ شخص کو حکم دیا جائے کہ ایک ماہ کے اندر اپنی مصالحتی کوششوں کی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں عدالت کو رپورٹ پیش کرے۔"

رپورٹ کی اس دفعہ میں عدالت سے باہر زوجین کی جس مفاہمت کا ذکر کیا گیا ہے، اصولاً ہمیں اس سے اتفاق ہے اور خود قرآن مجید (سورۂ نساء، ۳۵) میں بھی خانگی جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے حکمین کے تقرر کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ لیکن رپورٹ میں تجویز کردہ صورت قرآنی ہدایات سے بالکل مختلف ہے۔ قرآن مجید کا فرمان یہ ہے کہ جہاں میاں اور بیوی میں ناچاقی ہو جائے وہاں انقطاعِ نکاح تک نوبت پہنچنے یا عدالت میں معاملہ جانے سے پہلے گھر کے گھر ہی میں اصلاح کی کوشش کر لینی چاہیے اور اس کی صورت یہ ہے کہ میاں اور بیوی ہر ایک کے خاندان میں سے ایک ایک آدمی اس غرض کے لیے مقرر کیا جائے کہ دونوں مل کر اسباب اختلاف کی تحقیق کریں۔ پھر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور تصفیہ کی کوئی صورت نکالیں۔ اگر زوجین چاہیں تو اپنے اپنے رشتہ داروں میں سے خود ہی ایک ایک آدمی کو اپنے اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے منتخب کر لیں، ورنہ دونوں خاندانوں کے بڑے بوڑھے مداخلت کر کے پنچ مقرر کر دیں اور اگر عدالت میں مقدمہ پہنچ ہی جائے

تو عدالت خود کوئی کارروائی کرنے سے پہلے خاندانی ثالث مقرر کر کے اصلاح کی کوشش کرے

اس کے برعکس رپورٹ میں تجویز کردہ صورت یہ ہے کہ ہر ڈسٹرکٹ جج اپنے علاقے کے چند معزز اور غیر جانبدار اشخاص کی ایک مستقل فہرست تیار کرے اور عائلی عدالت جب بھی مصالحت کرانا چاہے، وہ زوجین کو حکم دے کہ وہ اسی فہرست میں سے کسی فرد کو ثالثی کے لیے منتخب کریں۔ اس فہرست ہی میں سے ثالث بنانے کی قید قرآنی حکم سے متصادم ہے اور اس سے وہ مقصد فوت ہو جاتا ہے جو حکمتِ قرآنی کے پیش نظر ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ میاں بیوی کے ذاتی اور پرائیویٹ معاملات و تنازعات صرف ایسے دو افراد کے سامنے رکھے جائیں جن میں سے ہر ایک مرد یا عورت سے قرابت داری و ہمدردی کا تعلق رکھتا ہو اور اس سے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہو کہ وہ نازک متنازعہ فیہ مسائل کو سلجھا سکے گا۔ اور سلجھا نہ سکے گا تو کم از کم ہر فریق متعلقہ آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ اس کے سامنے اپنے حالات بیان تو کر سکے گا۔ اس صورت میں مصالحت ہو یا نہ ہو گھر یلو باتوں اور رازوں کا افشاء تو نہیں ہوگا۔ ورنہ جج جو دائمی ضلعی فہرست مقرر کرے گا، ضروری نہیں کہ ہر میاں بیوی جس کے مابین کوئی اختلاف یا تنازعہ رونما ہو، ان کے خاندانوں کا ایک ایک معتمد علیہ فرد اس فہرست میں شامل ہو۔ ہو سکتا ہے کہ زوجین میں سے کسی ایک یا دونوں کے خاندانوں سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص سرے سے اس فہرست میں درج ہی نہ ہو، یا ہو مگر کسی فریق کو اس کے حَکَم مقرر کیے جانے میں تامل و اعتراض ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میاں یا بیوی کے خاندان کا کوئی فرد اس ضلع میں موجود ہی نہ ہو جس میں مقدمہ دائر ہے بلکہ اس کے اہلِ خاندان کسی دوسرے ضلع میں رہائش پذیر ہوں۔ غرض ایسی بہت سی صورتیں ممکن ہیں جن میں کمیٹی کے تجویز کردہ طریق کار اور "افسرانِ بہبود" کی مستقل اور پیشگی مرتب کردہ فہرست سے فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا کا قرآنی مقصود حاصل نہیں ہو سکے گا بلکہ اس سے مزید الجھنیں اور قباحتیں رونما ہوں گی۔ اس قسم کے "افسرانِ بہبود" کے سامنے زوجین کھل کر اور پورے اعتماد کے ساتھ کوئی ایسی بات نہیں کر سکیں گے جو وہ عدالت کے سامنے نہ پیش کر سکتے ہوں۔ اس طرح کے ویلفیئر آفیسر ہو سکتا ہے کہ حکومت یا عدالت کے لیے کچھ دوسری مفید خدمات انجام دے سکیں، لیکن یہ دیکھے بغیر کہ زوجین سے ان کا کوئی خاندانی رشتہ ہے بھی یا نہیں، بلا امتیاز انہیں ہر انہ دواجی نزاع میں دخیل بنا دینا اسلامی تعلیم اور قرآنی ہدایت کے خلاف ہے۔ اور اس سے معاملات سلجھنے کے بجائے اور زیادہ الجھنے کا امکان ہے۔ اگر ثالثی کی تجویز کو قانونی شکل دینا

ضروری سمجھا جائے تو اس کے لیے ناگزیر یہ ہے کہ ہر تنازعے یا مقدمے میں حَکَمَین کا تقرر بطور خاص کیا جائے اور اس میں اُن شرائط و حدود کو ملحوظ رکھا جائے جو کتاب و سنت اور فقہائے اُمت نے بیان فرمائی ہیں۔

یہ سطور لکھی جا چکی تھیں کہ ستمبر ۱۹۷۶ء کا "طلوع اسلام" نظر سے گزرا جس میں اس کمیٹی کی سفارشات کو بہت سراہا گیا ہے۔ صہ۵۹ پر ایک مضمون نگار لکھتے ہیں:

"معاہدۂ نکاح کے فسخ کرنے کا عورت کو اسی طرح حق حاصل ہے جس طرح مرد کو۔ جس طرح اپنے نکاح کے متعلق فیصلہ کا حق مرد کو حاصل ہے، اس میں عدالت کی مداخلت کی ضرورت نہیں، اسی طرح اس معاہدہ کے فسخ کرنے کا فیصلہ عورت کو از خود کر لینا چاہیے۔ اس میں عدالت کی مداخلت کی ضرورت نہیں۔"

پھر صہ۶۱ پر "طلوع اسلام" والے لکھتے ہیں:

"ان سفارشات میں بہت سے قانونی نقائص کی نشاندہی کی گئی ہے اور عورت کی کفالت کے سلسلہ میں بھی اطمینان بخش سفارشات موجود ہیں۔ لیکن نکاح طلاق سے متعلق یہی اہم سفارش ہے جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے یعنی عورت کے لیے یکساں حق طلاق۔ اس کے لیے اور عورتوں کے عام حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں جو سفارشات کی گئی ہیں، ان کے لیے ہم ارباب کمیٹی کو مستحق مبارک باد سمجھتے ہیں جی چاہتا ہے کہ اس میں تعدد ازدواج کے متعلق بھی کوئی سفارش سامنے آجاتی۔ ممکن ہے اور اسی قسم کی دیگر سفارشات رپورٹ کے اگلے حصے میں درج ہوں۔"

اس تحسین و آفرین کے بعد یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے کہ یہ رپورٹ کس طرزِ فکر اور نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہے اور کن لوگوں کو خوش کر سکتی ہے۔

اب ہم دفعہ ۶۵ اور دفعات مابعد کو لیتے ہیں۔ دفعہ ۶۵، ۶۶ اور ۶۷ کی رو سے کمیٹی کے ارکان نے ایک مزید "بے رحمی" کے ازالے کی کوشش کی ہے جو ان کے خیال کے مطابق خاوند بیوی کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ وہ بے رحمی یہ ہے کہ "شوہر اپنی بیوی کو اس کے والدین اور دوسرے قریبی رشتہ داروں سے ملنے سے

روک کر اس کی زندگی کو اذیت ناک بنا دیتا ہے۔ کمیٹی نے اس ظلم کو دفع کرنے کی یہ صورت تجویز کی ہے کہ اس جرم کے ارتکاب پر شوہر کے خلاف فوجداری و تعزیری کارروائی کی جائے اور مزید برآں ایسے بے رحم اور شقی القلب خاوند کے خلاف عورت کو عدالت سے فسخِ نکاح کی ڈگری حاصل کرنے کا حق بھی دیا جائے۔ چنانچہ دفعہ ۶۱ میں کمیٹی نے یہ سفارش کی ہے کہ:

"جبکہ شوہر یا اس کے رشتہ دار دانستہ طور پر زوجہ کو اس کے والدین، بچوں، بھائیوں یا بہنوں سے ملنے سے روکیں، تو اسے ایسا جرم قرار دیا جائے جو تین ماہ کی مدت تک قید یا جرمانہ یا دونوں سزاؤں کا مستوجب ہو۔ مذکورہ بالا جرم کے لیے شوہر کی سزا یابی کی صورت میں زوجہ اسے انفساخِ ازدواج کے لیے عذر کے طور پر پیش کر سکے گی۔"

اصولاً ہمیں اس بات سے اتفاق اور اس کا اعتراف ہے کہ اسلام نے حسنِ معاشرت اور صلۂ رحمی کے جو آداب سکھائے ہیں ان میں یہ بھی شامل ہے کہ خاوند مناسب و معقول حدود کے اندر بیوی کو اجازت دے کہ وہ اپنے قریبی اعزّہ سے وقتاً فوقتاً مل سکے۔ لیکن اس حق کے استعمال و عدمِ استعمال کے لیے کوئی قانونی و تعزیری ضابطہ بنانے سے پہلے خاصی سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ میاں بیوی کا رشتہ اور ان کے ازدواجی حقوق و واجبات کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ ان کے تعین و تصفیہ کے لیے دونوں کے پاس چند کتابچے قوانین و ضوابط کے ہر وقت موجود رہیں اور جہاں کوئی گھریلو غور طلب یا مختلف فیہ مسئلہ سامنے آئے دونوں ورق گردانی میں مصروف ہو جائیں اور پھر جس حق کو وہ قانون کے بل پر قابلِ وصول سمجھیں اس کے لیے عدالت کا دروازہ جا کھٹکھٹائیں۔ اب آپ یہی بیوی اور اس کے رشتہ داروں کے میل ملاقات کا مسئلہ ہی لیجیے۔ اس کے کئی پہلو اور کئی صورتیں ہیں جن کا وقوع ممکن ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بیوی یہ کہے کہ میں ہر روز یا ہر دوسرے یا تیسرے روز اپنے والدین یا بھائی یا بہن سے ملنا چاہتی ہوں یا میں یہ چاہتی ہوں کہ میرے یہ قرابت دار اسی طرح اتنے ہی وقفے سے مجھے آکر ملیں۔ بیوی یہ مطالبہ بھی کر سکتی ہے کہ میں عزیزوں سے ملنے جاؤں تو میرا شوہر مجھے لے کر جائے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ شوہر میرے ساتھ نہ جائے، مجھے تنہا جانے دے۔ اور جب تک میں چاہوں مجھے رشتہ داروں کے ہاں رہنے دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بیوی کے رشتہ دار کسی دوسرے شہر یا دوسرے ملک میں رہتے ہوں اور بیوی یہ کہے کہ مجھے گاڑی یا جہاز میں سوار کرا دو، میں منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤں گی۔ اب کمیٹی کے ارکان خود غور فرمائیں کہ ان ساری یا بعض صورتوں میں اگر خاوند بیچارا کچھ پس و پیش یا لیت و لعل

سے کام لے تو کیا وہ اس کا مستحق ہے کہ تین ماہ کی قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں بھگتنے اور اس کے بعد سزا یافتہ ہونے کی بنا پر تنسیخِ نکاح کا مقدمہ اور اہلیہ کا داغ مفارقت سہنے کے لیے بھی تیار ہو جائے؟

ہماری ان گزارشات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بیوی اور اس کے رشتہ داروں کی ملاقات کا حق بالکل خاوند کے رحم و کرم پر موقوف ہے اور وہ جس طرح چاہے اس پر قدغن لگا سکتا ہے لیکن اسلام اور عقلِ عام کی رُو سے یہ صورتِ حال بھی پسندیدہ یا گوارا نہیں ہے کہ بیوی صاحبہ جب چاہیں خاوند کو بتا کر یا بتائے بغیر گھر سے نکل کھڑی ہوں خواہ مقصود عزیزوں سے ملاقات ہی ہو۔ غیر اسلامی معاشروں کے تہذیبی معیارات و روایات میں یہ بات بالکل معیوب نہیں ہے کہ عورت خواہ کنواری ہو یا شادی شدہ، تن تنہا یا غیر محرم افراد کے ساتھ جہاں چاہے چلی جائے۔ لیکن اسلام عورت کو اس طرح گھر سے نکل کھڑی ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ عورت تین شبانہ روز کے سفر پر شوہر یا محرم مرد کے بغیر نہ نکلے خواہ یہ سفر حج ہی کیوں نہ ہو[1]۔ اور اس سے مراد فقہا نے اتنی مسافت لی ہے جو تین دن میں بآسانی پیدل طے ہو سکے۔ اب فرض کیجیے کہ میاں بیوی لاہور میں مقیم ہیں اور بیوی کے اعزہ پشاور یا کراچی میں ہیں تو بیوی کے حقِ ملاقات سے استفادہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس سفر کی آمد و رفت میں اس کا خاوند یا محرم ہمراہ ہو، ورنہ میاں بیوی دونوں گناہ گار ہوں گے۔ اسی طرح اگر بیوی کے بعض رشتہ داروں کی اخلاقی حالت اور خاندانی ماحول ایسا فاسد اور فتنہ انگیز ہو کہ بیوی بچوں کا وہاں جانا اور جا کر رہنا ان کے عادات و اطوار کے بگاڑنے کا باعث بنتا ہو تو خاوند اس امر میں حق بجانب ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کو وہاں جانے سے روک دے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ شادی غمی کی تقریبات میں انہیں شمولیت سے نہ روکے۔ بیماری یا پریشانی میں عیادت اور خبر گیری کی اجازت دے یا سسرال کے عزیز اپنے ہاں آجائیں تو خاوند ان کی آمد و ملاقات کی راہ میں حائل نہ ہو۔ یہ تو روابط و تعلقات کے شرعی پہلو ہیں، ان کے علاوہ بعض انتظامی اور عملی پہلو بھی ہو سکتے ہیں جو قابلِ غور و لحاظ ہوں۔ مثلاً ایک پہلو یہی ہے کہ بیوی کے قریبی عزیز اگر کسی دور دراز مقام پر ہیں تو خاوند کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ

---

[1] بخاری شریف اور دیگر کتب احادیث میں ارشاد نبوی وارد ہے کہ جو عورت اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ تین دن رات کا سفر بغیر محرم کے کرے۔ بخاری ہی کی دوسری حدیث میں تین کے بجائے ایک دن رات کے الفاظ بھی مروی ہیں۔

وہ آئے دن اپنے سارے کام چھوڑ کر محض ملاقات کے لیے اہلیہ کو ملوانے لے جائے، پھر واپس لائے، دو طرفہ اخراجاتِ سفر برداشت کرے ورنہ جیل کی ہوا کھائے۔

اس لیے کمیٹی کے اصحابِ دانش و بینش سے ہماری یہ گذارش ہے کہ بیوی کا اس کے رشتہ داروں سے حقِ ملاقات تو مسلّم ہے مگر اس کے لیے یا تو تعزیری و فوجداری ضابطہ نہ بنائیں اور سردست اسے زوجین کے احساسِ مروّت و مودّت (GOOD SENSE) ہی پہ چھوڑ دیں یا پھر قانونی ضابطہ بنانا ہی چاہیں تو ہمارے بیان کردہ مذکورہ بالا اُمور کو پیشِ نظر رکھ کر بنائیں تاکہ فریقین میں سے کسی کو بھی دقّت و دشواری کا سامنا نہ ہو۔ اگر خاوند کے لیے سزا اور تین ماہ قید کی حد مقرر کرنا آپ کے نزدیک روا ہے تو بیوی کے لیے عزیزوں سے ملاقات کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔ فقہاء نے ملاقات سے روکنے کو تعزیری جرم تو نہیں بنایا تھا، لیکن انہوں نے بیوی کے حقِ ملاقات کی تصریح کرتے ہوئے اس کی مناسب و معروف طریق پر تحدید کی ہے۔ مثلاً انہوں نے فرمایا ہے کہ شوہر بیوی کو والدین اور بہن بھائیوں کے ہاں جانے سے اور انہیں اپنے ہاں آنے سے نہ روکے، مگر یہ آمد و رفت ایک دستور کے مطابق ہو۔ اگر سب ایک ہی بستی میں مقیم ہوں تو ہفتے میں ایک مرتبہ اور متفرق شہروں میں ہوں تو سال میں ایک یا دو مرتبہ ملاقات کی اجازت ہونی چاہیے۔

بہر کیف اگر حقوقِ نسواں کمیٹی کو حقِ ملاقات کے لیے قانون وضع کرنے پر اصرار ہی ہے تو شرعی و عقلی بنیاد پر اس کے لیے کچھ حدود و قیود کی تعیین ضروری ہوگی۔ اس کے بعد اگر ملاقات سے روکنے پر خاوند کو تین ماہ تک کی سزا بھی لازم سمجھی جائے تو ہماری درخواست یہ ہے کہ خاوند کو جیل بھیجنے کے بجائے اُسے اپنے ہی گھر میں "پابند مسکن" بنا کر رکھنے کی سزا دی جائے اور بیوی اور بعض رشتہ دار سے ملاقات میں خاوند حائل ہوا ہے انہیں اس بات کا نگران مقرر کیا جائے کہ خاوند گھر سے باہر قدم نہ رکھنے پائے، اگر وہ ایسا کرے تو مفرور قیدی یا حوالاتی کے مانند اس کی سزا میں اضافہ کر دیا جائے۔ ہمارے ناقص خیال کے مطابق اس طرح انصاف کے مقاصد و مقتضیات زیادہ بہتر طریق پر پورے ہو سکیں گے۔ خاوند کے لیے قید کے بجائے یا قید کے علاوہ جو جرمانہ تجویز کیا گیا ہے، ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اُسے خزانہ میں داخل کرنے کے بجائے بیوی اور اس کے رشتہ داروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ کمیٹی اس امر پر بھی غور فرمائے کہ بیوی اگر الگ گھر بنانے کا مطالبہ کرے اور اس گھر میں شوہر کے والدین اور بھائی بہنوں کے آنے پر ہنگامہ برپا کر دے اور پورا گھر سر پہ اُٹھالے

تو اس پر بھی کوئی تعزیر و تادیب قانوناً جائز و مناسب ہوگی یا نہیں؟

دفعہ ۶۷ کے بعد رپورٹ کی دفعہ ۶۸، ۶۹ میں طلاق کے بعد نابالغ اولاد کی حضانت و تحویل کے مسئلے کو لیا گیا ہے۔ رپورٹ کے بقول:

"نابالغ بچوں کی ولایت یا تحویل کے مقدمے میں ماں کے دعوے کو باطل کیا جا سکتا ہے اگر یہ ثابت ہوجائے کہ وہ غیر اخلاقی زندگی گزار رہی ہے یا بُرے کردار کی عورت ہے۔ بدقسمتی سے عورت کے خلاف یہ عذر اِن مقدمات میں مسلسل پیش کیا جاتا ہے جبکہ کوئی تنازعہ بچوں کی تحویل کی نسبت (؟) ہو۔ صرف چند صورتوں میں بدچلنی یا بدکرداری کے الزامات ثابت ہوتے ہیں اور زیادہ تر یہ الزامات جھوٹے ثابت ہوتے ہیں اور عورت کی شہرت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ ایسے مقدمات میں عدالت عموماً کوئی کارروائی نہیں کرتی گو اسلام میں عورت پر بدچلنی کی جھوٹی تہمت لگانے کی مذمت کی گئی ہے۔ اِس سلسلے میں سورۂ نور کی آیت ۲۳ کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے"۔

اِن مقدمات میں عورتوں کے خلاف جھوٹے الزامات پر پابندی عائد کرنے کی غرض سے کمیٹی نے یہ سفارش کی ہے کہ:

"بچوں کی تحویل سے متعلق مقدمات میں اگر کسی عورت کی پاکدامنی یا کردار پر الزامات عائد کیے جائیں اور اگر ایسے الزامات جھوٹے ثابت ہوں تو عدالت کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ متعلقہ فریق کو اظہار وجوہ کا موقع دینے کے بعد چھ ماہ کی مدت تک قید محض یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دے سکے"۔

اس بات سے انکار کی تو گنجائش ہی نہیں ہے کہ کسی مسلمان عورت یا مرد کے خلاف جھوٹی تہمتِ زنا (قذف) گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن عدالتوں میں ایسی تہمتیں عائد کرنے کی وجہ اور اس کے انسداد کے لیے جو سفارش کمیٹی نے کی ہے، ان دونوں سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ فریقینِ مقدمہ ایک دوسرے کے خلاف ایسی گھناؤنی تہمتیں آسانی سے محض اس وجہ سے لگا دیتے ہیں کہ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ابھی تک زنا اور قذف سے متعلق حدودِ شرعیہ کا نفاذ نہیں ہوسکا۔ اور جب تک زنا پر رجم یا سو کوڑے اور جھوٹی تہمتِ زنا پر اسّی کوڑے کی سزا سرزمین پاکستان میں نافذ و جاری نہ ہوگی اُس وقت تک اس صورتِ حال کی کلی اصلاح نہیں ہوسکے گی جو کمیٹی کے پیشِ نظر ہے۔ نفاذِ شریعت سے ہماری اس محرومی اور بدنصیبی کا دَور جب تک ختم نہیں ہوتا، اس وقت

تک ہمارے نزدیک زیرِ بحث مقدمات میں طلاق دہندہ اور مطلقہ ایک دوسرے کے خلاف جو الزام تراشی کرتے ہیں اس کی روک تھام کے لیے سردست یہی کافی ہے کہ فریقین پہ قانونی بندش لگا دی جائے کہ وہ بچوں کی حضانت و تحویل کے مقدمات میں ایک دوسرے پہ بداخلاقی و بدکرداری کے ایسے الزامات نہ لگائیں جن کا صراحۃً یا کنایۃً تعلق فریقِ ثانی کی عصمت و عفّت سے ہو، ورنہ ایسے استغاثے کو ناقابلِ سماعت قرار دے دیا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ صورت بے حد افسوسناک بلکہ شرمناک ہے کہ عدالت میں زنا کا الزام سچا ثابت ہو یا جھوٹا دونوں صورتوں میں اس پہ قرآنی و شرعی حد کو چھوڑ کر کوئی دوسری سزا دی جائے یا مجرم کو کوئی سزا ہی نہ دی جائے۔ زنا بالرضا تو ہمارے ہاں کوئی جرم ہی متصور نہیں ہوتا۔ حال ہی میں ایک کالج کے اساتذہ جو الزامِ زنا میں ماخوذ ہیں، ان میں سے بعض کی طرف سے یہی صفائی پیش کی گئی ہے کہ اگر فریقین نے باہمی رضامندی سے اس کا ارتکاب کیا ہے تو قانون کی نگاہ میں یہ کوئی جرم نہیں ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ شریعت کے ساتھ ایسا سنگین استہزا کم از کم حدودِ عدالت میں نہیں ہونا چاہیے۔ (باقی)

(بقیہ رسائل و مسائل)

بالعموم علمائے سلف کے متعدد اقوال میں سے کسی ایک قول ہی کو اختیار کرتے ہیں۔ ان مسائل میں تفرد و شذوذ اگرچہ ممنوع و حرام نہیں، تاہم اس کے حق میں بڑے مضبوط اور وزنی دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن مولانا کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مطالعہ اور غور و فکر کے بعد مختصراً اپنی تحقیق بیان کر دیتے ہیں۔ یہاں تو حضرت قتادہ کا حوالہ دے دیا ہے لیکن اکثر مقامات پر وہ یہ ذکر نہیں کرتے کہ اسلاف میں سے کس کس نے وہی بات کہی ہے اور اور یہ عدمِ ذکر اس اعتماد پہ ہوتا ہے کہ اہلِ علم اصل مراجع و مآخذ تک دسترس رکھتے ہیں اور وہ خود ہی مسائل کی چھان بین کر لیں گے۔ لیکن سہل انگاری یا معاصرانہ چشمک سدِّ راہ بن جاتی ہے اور بعض لوگ خواہ مخواہ بحث و نزاع میں منہمک ہو کر اپنا اور دوسروں کا وقت غیر ضروری ردّ و کد میں کھپاتے رہتے ہیں۔

دی چلڈرن قرآن سوسائٹی لاہور

کی

پیاری پیاری کتابیں

سوسائٹی نے قرآن حکیم اور سیرت النبوی کی تعلیم کے نچوڑ کو عام لوگوں تک پہنچانے کیلیے **۲۶** کتابوں میں ان کی اشاعت کا بندوبست کیا ہے۔ یہ سلیس اور آسان اُردو میں لکھی گئی ہیں جو تیسری جماعت تک پڑھا ہوا بچہ اور بڑا بھی پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔ تھوڑے پڑھے ہوئے اور اَن پڑھ بھی اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ سوسائٹی اس وقت تک پندرہ کتابیں شائع کر چکی ہے اور باقی زیر تالیف وطباعت ہیں

ہر کتاب کی قیمت /2 روپے ہے

۱ - سب سے مہربان انسان

۲ - سب سے بڑے جرنیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم

۳ - بچوں کے لیے نماز ترجمہ کے ساتھ

۴ - بچوں سے پیار کرنے والا رسولؐ

۵ اور ۶ } جان و مال سے جہاد کرنے والا مجاہد حصہ اوّل و دوم

۷ تا ۱۵ } قصص القرآن - حصہ اوّل تا حصہ نواں

قصص القرآن میں صرف قرآنی واقعات کو ہی لیا گیا ہے اور ہر قصے کے آخیر پر پیغمبر کی تعلیم کا نتیجہ بھی لکھا ہے۔ آپ یک صد روپیہ دے کر تاحیات ممبر بن سکتے ہیں اور آپ کو ہر کتاب مفت دی جائے گی۔ یہ کتابیں محکمہ تعلیم کے اسکولوں اور مدرسوں کیلیے منظور شدہ ہیں

نوٹ: آپ اپنے قریبی بک سٹال سے طلب کریں یا براہ راست سوسائٹی سے منگوائیں

دی چلڈرن قرآن سوسائٹی ۱۴ - وحدت روڈ لاہور فون نمبر ۳۵۳۳۸۹

ترجمۂ قرآن مجید

مع مختصر حواشی

از: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

اِس میں مصنف نے قرآنِ حکیم کے متن اور تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی درج کر دیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآن مجید کا سیدھا سادھا مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں تفہیم القرآن کے خلاصے سے فائدہ اٹھا سکیں۔

جو حضرات پیشگی روپے روانہ کر دیں گے انہیں یہ مترجم و محشّٰی قرآن مجید رقوم کی ترسیل کے مطابق ترتیب وار بھیجا جائے گا

ہدیہ قسم اعلیٰ	۷۵/- روپے
ہدیہ قسم دوم	۶۰/- روپے

پیشگی رقم ارسال کرنے والے حضرات سے محصول ڈاک نہیں لیا جائے گا

ناظم ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ - لاہور

فون نمبر: ۴۱۱۰۱۶ — ۴۱۱۰۱۷